بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ70، اکتوبر-2023 جلدنمبر16

Tahreek-e-adab vol-16, issue-70, October 2023

مدیر Editor

جاویدانور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik Ex.HOD Urdu,Jammu University

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

عظیم حسین، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد، ڈاکٹر فروز حیدری،
عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Azeem Hussain(Director,Idiol Offshore,Mumbai)

Prof. Arifa Bushra(Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad(Chairman Rosewood Academy,VNS

Irfan Arif(H.O.D.Dept. of Urdu,Govt.SPMR College of Commerce,Cluster University of Jammu,Jammu)

Dr.Chaman Lal Bhagat(Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2023 (جلد نمبر16) Vol-16

شمارہ نمبر ،شمارہ70۔اکتوبر، Issue October 2023

سرنامہ خطاط:انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دوہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Tahreek-e-adab IFSC IOBA 0001968 Current A/C no.196802000000440 Indian Overseas Bank, Glenhill School Ext. Counter,Manduadih Bazar,Varanasi-221103(U.P) India

***

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087 State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

مضامین:

1۔طارق چھتاری کا افسانہ" آدھی سیڑھیاں" ڈاکٹر سید محمود کاظمی 5

2۔حامد حسن قادری کی وطن پرستی:

نظمیہ شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر آصف علی 9

3۔اختر حسین جعفری بحیثیت جدید نظم نگار ڈاکٹر بلال احمد وانی 18

4۔ترنم ریاض کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ طالب حسین ڈار 22

5۔ڈاکٹر طاہر تونسوی بحیثیت نقاد نوید الحسن، نذرانہ بی بی 32

غزلیں: اسلم عمادی، خالد جمال، سہیل اقبال 40

مضامین:

1۔حضرت میاں نظام الدین لاروی تے جدید

گوجری زبان وادب (گوجری ادب) پروفیسر ڈاکٹر رفیق انجم 44

2۔نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری شاہنواز انصاری 55

3۔مخدوم محی الدین کی نظم" چاند تاروں کا بن"

کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ شبنم انصاری 61

نظمیں: اشفاق انجم سامون، عبدالحامد خاں غریق 67

افسانہ: خواب ریزہ ریزہ عاشق آکاش 69

Tariq Chhetaari ka afsana "Aadhi Sidhiyan" ek zaviya-e-tafheem
ye bhi by Dr. Syed Mahmood Kazmi (HOD Translation, MANUU,
Hyderabad)cell-9949060358

ڈاکٹر سید محمود کاظمی (صدر شعبۂ ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد)

طارق چھتاری کا افسانہ" آدھی سیڑھیاں"
ایک زاویہ نظر یہ بھی

طارق چھتاری کے افسانے ''نیم پلیٹ'' کے تجزیے کے دوران پروفیسر حامدی کاشمیری نے ایک بے حد اہم بات یہ کہی تھی کہ افسانہ موضوع پر نہیں تجربے پر اُستوار ہوتا ہے یا اُسے ہونا چاہئے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس تجربے کو افسانے کا پیکر عطا کیا جائے وہ افسانہ نگار کا اپنا ہو یا ذہنی وجذباتی طور پر افسانہ نگار کسی اور کے تجربے سے اتنا قریب ہو کہ وہ افسانے میں اس کی فنکارانہ پیش کش کا حق ادا کر سکے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایک اچھے اور فنی طور پر کامیاب افسانے کی تخلیق کے لیے یہ دونوں ہی صورتیں کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ میں یہاں تجربے کے ساتھ مشاہدے کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں کہ تجربے کی ایک صورت یہ بھی ہے اور جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ سنی سنائی پر آنکھوں دیکھی کو ہمیشہ فوقیت دی جاتی رہی ہے۔طارق چھتاری کا زیر بحث افسانہ ''آدھی سیڑھیاں'' بھی تخلیق کار کے تجربے اور مشاہدے سے گزر کر ایک ایسا بصری پیکر بن گیا ہے جس کی تجسیم کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک تخلیق کار اس بات سے واقف نہ ہو کہ علامت واستعارے کی دنیا سماجی وتہذیبی شعور کے بغیر ہمیشہ اندھیری رہتی ہے۔ وارث علوی نے جدید افسانے کی خامیاں بیان کرتے ہوئے کہیں کہا تھا کہ جدید افسانے کا بیانیہ حاضراتی نہیں بلکہ Opaque یعنی مبہم ہے کیونکہ افسانہ نگار صرف واقعہ یا صورت حال بیان کرتا ہے، دکھاتا نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جہاں تک میرا قیاس کام کرتا ہے اس کی وجہ افسانے میں تہذیبی تعلیقات کا علامت اور علامت کا تہذیبی تعلیق نہ بن پانا ہے۔طارق چھتاری نے زیر بحث افسانے کے آغاز میں ہی علامت اور تہذیبی تعلیقات کے اس لازمی وناگزیر باہمی ربط کو افسانے کے

لسانی ولفظیاتی نظام سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان کا بیانیہ مبہم نہ ہو کر حاضراتی بیانیہ کے بیش تر تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے۔ افسانے کا پہلا جملہ ملاحظہ ہو:

''سعیدہ بیگم اپنے کمرے سے نکل کر دہرے دالان سے ہوتے ہوئے احمد کے کمرے میں داخل ہوئیں۔''

سعیدہ بیگم کا اپنے کمرے سے نکلنا اور دوہرے دالان سے گزرتے ہوئے اپنے بیٹے احمد کے کمرے میں داخل ہونا۔ کیا یہ محض اس افسانے کا ایک ڈرامائی آغاز ہے؟ نہیں بلکہ یہاں بین السطور افسانہ نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سعیدہ اور احمد کا تعلق دو الگ پیڑھیوں سے ہے، پہلی پیڑھی سعیدہ بیگم کی ہے کہ جس کا سرمایۂ حیات اس کا ماضی ہے اور دوسری احمد کی ہے جس کے لیے ماضی اور اس کا Nostalgia محض ایک ذہنی عیاشی تو ہو سکتا ہے لیکن بہت دور تک ساتھ لے جانے والی چیز نہیں۔ دونوں کی سوچ میں یہ فرق ہی Generation Gap کہلاتا ہے۔ لیکن کیا سعیدہ اور اس کے بیٹے کے درمیان کوئی بھی ایسی کڑی نہیں ہے جو انہیں الگ نہ ہونے دے۔ میرا خیال ہے اور میرا ہی نہیں خود افسانہ نگار کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بے شک دونوں کے کمرے ایک دوسرے سے دور اور الگ ہیں لیکن ان دو کمروں کے درمیان دوہرا دالان بھی موجود ہے۔ دُہرا دالان جو علامت ہے اس تہذیب کی، اس کے شعور و ادراک کی، اس کے عرفان کی جو وقت کے ساتھ تبدیلی کے عمل سے بھی گزرتی ہے لیکن ختم نہیں ہوتی۔ اور اسے ختم ہونا بھی نہیں چاہئے۔ اس کے دونوں سروں پر موجود کمروں میں رہنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسے قائم رکھیں تا کہ ایک دوسرے کے کمروں تک آ جا سکیں۔ افسانے کے اس پہلے جملے سے ہی افسانہ نگار کے تخلیقی وژن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ خود افسانہ نگار اس وژن کی تجسیم کے لیے دہرے دالان کے ساتھ ہی آفتابہ اور سلفچی کو دو طاقت ور تہذیبی علامتوں کے طور پر پیش کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افسانہ نگار نے ان دو اشیاء کا استعمال شعوری طور پر کیا ہے یا پھر یہ اس تہذیبی منظر نامے کا از خود حصہ بن گئیں کیونکہ بیلا نشے (Balanche) نے کہا تھا کہ ''علامت ایجاد نہیں کی جا سکتی یہ تو لاشعور کا حصہ ہے۔'' میرا خیال ہے کہ افسانہ نگار نے دہرے دالان کے ساتھ ہی آفتابہ، سلفچی اور رکابی جیسے الفاظ کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی لفظ اپنے تہذیبی سیاق کے بغیر اگر علامت کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو اس کی حیثیت ایک پہیلی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگی اور اس سے سب سے زیادہ نقصان بیانیہ کو پہنچے گا جو افسانے کے لیے اسی قدر ضروری ہے جیسے غزل

کے لیے تغزل۔ افسانہ نگار رکابی کی جگہ پلیٹ اور آفتابہ کی جگہ لوٹے کا لفظ لاسکتا تھا لیکن اس سے وہ قاری کو اس تہذیبی منظرنامے تک کیسے پہنچاتا جو ابا کا حقہ، گول ریشمی ٹوپی، اچکن، کم خواب اور پوتھ کے غرارے جیسے بصری پیکروں سے تشکیل پاتا ہے اور جو افسانے کے آخری حصے میں گاؤں سے شہر کی جانب ہجرت کے سبب بکھر کر رہ جاتا ہے۔ شہر کا مکان جہاں نہ دوہرا دالان ہے اور نہ ہی وہ صحن کہ جہاں اچکن، گرم شیروانی اور کم خواب و پوتھ کے غراروں کو دھوپ دکھائی جاسکے اور جہاں سعیدہ بیگم کو پان کی پیک تھوکنے کے لیے اُگال دان اپنی چارپائی کے نیچے ہی مل جایا کرے۔ لیکن کیا افسانہ نگار نے قاری کو پہلے ہی سے باخبر نہیں کر دیا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب شہتیر کے کنڈے میں جھولتا ہوا جنگلی کبوتر اچانک پر پھلانے لگے اور روشن دان کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے تیزی سے نکل کر باہر پھیلے اندھیرے میں گُم ہوجائے تو ایک ایسی ان چاہی ہجرت کی آہٹ قاری کو محسوس کر لینی چاہئے تھی کہ جو اس کنبے کا مقدر بننے والی تھی اور جسے خود افسانے کے ایک کردار لالہ دیوی سرن نے نہ صرف یہ کہ محسوس کر لیا تھا بلکہ احمد کو سود پر روپیہ دینے سے انکار کر کے اسے یقینی بنا دیا تھا۔ یہ جملے ملاحظہ ہوں:

''سوچا اب آیا ہوں تو آپ سے مل آؤں اور پھر نیوتا جو دینا تھا۔ کاہے کا نیوتا احمد میاں۔۔۔ لالہ جی کا ہاتھ پیٹ پر رینگنے لگا۔''

افسانے کے عام قاری کے لیے نیوتے کی بات سن کر لالہ جی کا پیٹ پر ہاتھ پھیرنا محض لالہ کی خوش خوراکی سے واقف ہونے کا ذریعہ رہا ہو لیکن اہل قاری سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس نکتے سے بے خبر ہو کہ افسانہ نگار نے فنکارانہ مہارت کے ساتھ اس جبری ہجرت کے امکانات سے قاری کو واقف کرا دیا تھا جو زرعی معیشت پر مہاجنی معیشت کے بڑھتے تسلط کے نتیجے میں وجود پذیر ہوتی رہی ہے اور جس سے پریم چند سے لے کر طارق چھتاری جیسے معاصر افسانہ نگار کے لیے صرف نظر کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ پریم چند کا افسانہ ''سوا سیر گیہوں'' ہو یا طارق چھتاری کا'' آدھی سیڑھیاں''، مہاجنی استحصال کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس استحصال کی کہانی محض مجرد بیانیہ کے توسط سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ افسانہ نگار ایک بڑے ویژن کی تکمیل اور پھر اس کی فنکارانہ پیش کش کو اسی وقت ممکن بنا سکتا ہے جب وہ معروضی تلازمات کو برتنے کا ہنر جانتا ہو۔ ہری گولیوں والا بچہ ابتدا میں جیت رہا ہوتا ہے لیکن ہری گولیوں سے شروع ہونے والا اس بچے کا یہ سفر احمد کے لہلہاتے ہوئے ہرے کھیتوں سے ابھی پوری طرح ہم آہنگ بھی نہیں ہونے پاتا کہ منظر بدل

جاتا ہے۔ زرعی معیشت پر مہاجنی استحصال اپنی گرفت مضبوط کرلیتا ہے اور ہری گولیوں کی جگہ چاروں طرف لال گولیاں زمین پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی یہ گولیاں اپنے عکس سے سرسبز کھیت کو بھی سرخ کردیتی ہیں۔افسانہ نگار کے تخلیقی وژن کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ اس نے مجرد حقیقت نگاری سے بچتے ہوئے ایک بڑے اور پھیلے ہوئے اقتصادی منظرنامے کو مخصوص تہذیبی حوالوں کی مدد سے اس طرح روشن ومنور کردیا ہے کہ جبر واستحصال کی تمام صورتیں نہ صرف یہ کہ واضح ہوجاتی ہیں بلکہ ایک ایسے تہذیبی بکھراؤ کا لازمہ بن کر سامنے آتی ہیں جس کی تہہ میں اکثر وبیشتر مزید معاشی وسائل کی تلاش اور ان کے حصول میں ناکامی کا المیہ موجود ہوتا ہے

۔

طارق چھتاری نے ابتدا میں جس دہرے دالان کا ذکر کیا تھا، افسانے کے بالکل آخر میں اسی کی ایک محراب میں لٹکنے والی لالٹین ہوا کے جھونکے سے ہلتی ہوئی نظر آتی ہے جس کے سبب سے سعیدہ بیگم کا سایہ کبھی طویل ہوتا اور کبھی سمٹ جاتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس منظر کی مدد سے افسانہ نگار نے جس المیے کو بصری پیکر عطا کیا ہے کیا وہ محض سعیدہ بیگم کا ہی المیہ ہے یا پھر ہر اُس نسل کا جس کے بعد کی نسل کی ترجیحات اس سے مختلف ہوتی ہیں۔زینے کی آدھی سیڑھیاں چڑھ کر لوٹ آنے والی سعیدہ جانتی ہے کہ اس کی بلندیوں کا سفر اب ختم ہوچکا ہے۔جس درخت کی جڑیں ہل چکی ہوں اس کا مزید بڑھنا اور بلند ہونا اسے ہمیشہ کے لیے زمیں بوس کردیتا ہے۔وہ تنہائی جو شہر جا کر سعیدہ بیگم کا مقدر بن گئی شائد مہمانوں کی اس بھیڑ کا لازمی ومنطقی نتیجہ تھی جو سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے لڑکے کی شادی کے موقع پر اس نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے جُٹائی تھی اور جس کے لیے اس کے بیٹے احمد کو پشتینی زمین لالہ دیوی سرن کے ہاتھوں بیچنی پڑی۔افسانہ انہیں بصیرتوں سے افسانہ بنتا ہے نہیں تو ہم اسے محض Pop Fiction کی ہی ایک قسم قرار دے سکتے ہیں اور بس۔

☆☆☆

Hamid Hasan Qadri ki Watan Parasti : Nazmiya Shayri ke Hawale se by Dr. Asif Ali (Asst. Prof. Dept. of Urdu CCS University, Meeraut) cell-96399878

ڈاکٹر آصف علی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

حامد حسن قادری کی وطن پرستی: نظمیہ شاعری کے حوالے سے

انسان کے پاس اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کے اظہار کے یوں تو دو وسیلے ہیں۔ نثر اور نظم مگر موخر الذکر وسیلے کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص اردو میں تو اظہار کے اس وسیلے کی روایت کچھ زیادہ ہی شاندار ہے۔ آج کے دور انحطاط میں بھی اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس کے مخالف تک اپنی تقریروں اور تحریروں میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ہر محفل میں اردو داں حتیٰ کہ اب تو ہر پڑھے لکھے مسلمان سے شعر سنانے کا اصرار کیا جاتا ہے۔ اس کی اس مقبولیت سے اسے یہ نقصان بھی پہنچا ہے کہ بہت سے ایرے غیرے نتھو خیرے قسم کے شاعر پیدا ہو گئے ہیں جو اپنی تک بندیوں سے اردو شاعری کے وقار کو مجروح کر رہے ہیں۔ آپ خود اندازہ لگائیے کہ آج کس کثرت سے شعری مجموعے شائع ہو رہے ہیں مگر خدا جھوٹ نہ بلائے تو بیشتر میں کوئی ایک تخلیق یا شعر بھی اس پائے کا نہیں ہوتا جو اردو شاعری کا اصل امتیاز ہے۔ آتشؔ نے کہا تھا ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

چنانچہ اسی لیے اس میدان میں انہی شعرا کو مقبولیت اور آفاقیت نصیب ہوئی ہے جن کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق طرزِ نگارش لطیف اور قوتِ متخیلہ حساس تھی۔ اس فہرست میں بجا طور پر حامد حسن قادری کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ حامد حسن قادری کا اصل شعری سرمایہ تو مادہ تواریخ پر مشتمل ہے۔ وہ اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ سید خالد حسن قادری اپنے والد محترم کی اس خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''والد صاحب قبلہ مولوی حامد حسن قادریؒ اردو کے ممتاز تاریخ گو رہے ہیں۔ موصوف نے چار مجموعے جن میں بے شمار تاریخیں درج ہیں مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ غیر مطبوعہ کلام کی شکل میں

چھوڑے ہیں۔(۱)دفتر تواریخ (۲)میزان التواریخ (۳)جامع التواریخ (۴)آثار التواریخ موصوف پابندی سے روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ان کے روزنامچے محفوظ ہیں اوران میں تقریباہر صفحے پران کی کہی ہوئی تاریخیں درج ہیں،جن کی تعداد بلامبالغہ ہزاروں سے متجاوز ہے۔''

(میزان التواریخ،حامدحسن قادری،پیش لفظ)

البتہ ان کا روایتی شعری سرمایہ یعنی غزل ونظم وغیرہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں زیادہ نہیں ہے۔''سفینۂ نظم ونثر'' کے عنوان سے ان کے صاحب زادے خالدحسن قادری نے 2004ء میں 180 صفحات پرمشتمل ایک کتاب شائع کی تھی جس میں نثری مضامین کے علاوہ ان کی کچھ نظمیں اورغزلیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔یہ تمام تخلیقات''تہذیب'' رام پور،''زمانہ'' کانپور،''علی گڑھ منتھلی'' علی گڑھ،''آزاد'' لاہور،''مخزن'' لاہور،''شمس'' کلکتہ،''زبان'' دہلی اور''صبح بہار'' میسور جیسے اپنے عہد کے موقر وممتاز جرائد میں شائع ہوچکی ہیں۔ممکن ہے ان جرائد میں ابھی کچھ مزید تخلیقات بھی موجود ہوں۔اس سے بہرحال حامدحسن قادری کی روایتی شاعری کی کم گوئی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے مگرجس طرح محض بسیارگوئی کسی شاعر کی مقبولیت کی ضمانت نہیں ہوسکتی ٹھیک اسی طرح کم گوئی بھی کسی شاعر کی عدم مقبولیت کی دلیل نہیں ہوسکتی بلکہ اس کی تخلیقات میں درآنے والی تعبیری اورتشریحی کیفیت کا حسن اورفنی تکریم کی محکم بنیاد اس کا جواز فراہم کرے گی۔اس اعتبار سے دیکھیں تو یقینا حامدحسن قادری کا نام کم گوئی کے باوجود بقائے دوام کی اہمیت کا حامل ہے۔کیونکہ ان کی تمام شعری تخلیقات اعلیٰ افکاروخیالات کی طرفگی ودلکشی اورکمالات وامتیازات کے سبب الگ پہچانی جاسکتی ہے۔

حامدحسن قادری،نظیراکبرآبادی اوراقبال کے سلسلے کے شاعر تھے۔بامقصد شاعری،عمل کی تلقین اوروطن سے محبت ان کا مقصدحیات تھا۔نظیراکبرآبادی کی تقلید میں توانہوں نے باقاعدہ ایک نظم''قومی فقیر کی صدا''تخلیق کی ہے۔دراصل وہ ایک اعلی صوفی اوردینی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔اس لیے دنیا سے بے رغبتی اسلامی فلسفے میں دلچسپی اور بزرگوں سے عقیدت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔نظیراوراقبال کی طرح حامدحسن قادری کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے تمام مروج شعری اصناف بالخصوص اردوشاعری کی آبرواورپیرایۂ اظہار میں سب سے موثر سمجھی جانے والی صنف غزل پرقدرت کاملہ رکھنے کے باوجود اپنی جولانی طبع کے اظہار کے لیے نظم کوخصوصی طور پراپنایا تھا۔دراصل قوم وملت کی اصلاح اوروطن کی خدمت کا جومقصدان کے پیش نظر تھا اس کے لیے غزل کی ریزہ خیالی کی بجائے نظم کے تسلسل کی ضرورت تھی۔

حامد حسن قادری کی بیشتر نظمیں اپنے منفرد طرز و خیال، شائستگی و برجستگی، بصیرت و آگہی، فلسفہ وفکر، لفظیات وعلامات اور حسن وخوبی کے اعتبار سے بڑی مکمل اور لائق تحسین ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ ان کے وطن پرستانہ جذبات سے لبریز کچھ نظموں کے حوالے سے بات کروں۔ کیوں کہ ہماری وطن پرستی پر جو شبہات کیے جارہے ہیں اس کے پس منظر میں اپنے اسلاف کے وطن پرستانہ کارناموں کو منظر عام پر لانا بھی عبادت سے کم نہیں۔ سفینہ نثر و نظم کے بالاستیعاب مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی فلسفے کی طرح حامد حسن قادری کے یہاں وطن پرستی کا جذبہ بھی ایک فکر بن کر ابھرا ہے۔ جستہ جستہ اشعار کے علاوہ اس مجموعے میں کئی ایسی نظمیں ہیں جو میرے نزدیک اسی موضوع کو مرکز بنا کر تخلیق کی گئی ہیں۔ جن میں ہندوستان کے شاندار ماضی سے لے کر قوم کے زوال اور اس کے سد باب تک کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی ایسی نظموں میں ''وطن کی حالت''، ''یاد وطن''، ''انقلاب وطن''، ''ایشائی شاعری''، ''گلشن تہذیب''، ''میری قوم''، ''تضمین قومی''، ''رفتگانِ عدم'' اور ''کام کرو یا مرجاؤ'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذہب اسلام میں وطن دوستی کو ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت بتایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ حامد حسن جیسا خدا پرست اور سچا عاشق رسول ایمان کی اس علامت پر کھرا نہ اترتا۔ چنانچہ ہمیں ان کے کلام میں وطن دوستی کے متعدد رنگ مختلف انداز میں نظر آتے ہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ جب اس سے کوئی چیز چھن جاتی ہے تب اسے اس کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل یہ اس کے ساتھ اس کی محبت اور لگاؤ کی دلیل ہے۔ وطن سے محبت کا صحیح احساس بھی وطن سے دور جانے کے بعد ہوتا ہے۔ حامد حسن قادری نے اپنے اس احساس کو اپنی نظم ''یاد وطن'' میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یوں تو مجموعی تاثر کے لیے پوری نظم ضروری ہے جو بہر حال ممکن نہیں۔ تاہم یہ بند ملاحظہ کرلیں اور حامد حسن قادری کے جذبۂ وطن دوستی کی داد دیں ؎

پردیس میں ہیں کیا کیا سامان عیش وعشرت
لیکن مسافروں کی لگتی نہیں طبیعت

دو دن کی زندگی بھی ہے کاٹنا مصیبت
یاد وطن سے دل کو ہوتی ہے سخت وحشت

کانٹا بھی اس چمن کا اک پھول ہے نظر میں
سودا بھرا ہوا ہے حب وطن کا سر میں

ایسی کشش ہے اس کے دیوار اور در میں
دل گھر ہی میں ہے رکھا ہم لاکھ ہوں سفر میں

مل جائے ہم کو یارب وہ جھونپڑا پرانا
یعنی وہ گھر ہمارا چھپر پڑا پرانا

وہ کرم خوردہ کمبل وہ بستر ا پرانا
سامان عیش وراحت جو ہو نیا پرانا

مدفن بھی بس وہیں ہو مولد جہاں ہے میرا اجڑا ہوا مرا گھر اک گلستاں ہے میرا
وہ خانہ باغ ویراں باغ جناں ہے میرا فردوس سے بھی بڑھ کر ٹوٹا مکاں ہے میرا
آرام اپنے دل کو دنیا میں بس وہیں ہے پیارے وطن سے پیاری کوئی زمیں نہیں ہے

محبت اور دوستی کا ایک عجیب فلسفہ ہے کہ جس سے کی جاتی ہے اس کی گلی کی ہر شئے ممتاز نظر آتی ہے۔ حامد حسن قادری کے یہاں بھی وطن دوستی کی ایسی مثالیں موجود ہیں مثلاً ادب جو اس زبان کے قارئین کے لیے دلچسپی اور گرویدگی کا باعث نیز اس کی نظر میں دوسرے ادبوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ لہٰذا حامد حسن قادری نے بھی ''ایشائی شاعری'' کے عنوان سے ایک نظم تخلیق کر کے اردو شاعری کے امتیازات کا اظہار کر کے وطن دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

تو بھی اے شاعری وہ جادو ہے دل کی تسخیر ہے جسے حاصل
آ ادھر میں تیری بلائیں لوں تجھ پہ قربان ہیں ہزاروں دل
اپنی ناز و ادا کو دکھلا کر تو نے اک اک کو کر دیا بسمل
جان تجھ پر نثار کرتا ہے خواہ عالم ہو خواہ ہو جاہل
تجھ میں جادو بھرا ہے کچھ ایسا جس کو دیکھا وہ تجھ پہ ہے مائل

ایک دوسرے مقام پر رسالہ ''تہذیب نسواں'' لاہور، کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گلشن تہذیب تو ہے بوستانِ بے خزاں گلشن تہذیب تو ہے غیرت باغ جناں
گلشن تہذیب تیرا جس جگہ سایہ پڑا ہو گیا سرسبز عالم میں وہ سارا خاندان
جس گھرانے میں گئی تیری نسیم جاں فزا ہو گئے ترقی کے پیدا نشاں
ترے گلہائے شگفتہ جس جگہ رکھے گئے ان کی خوشبو سے معطر ہو گیا سارا مکاں

یہی نہیں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وطن کی ترقی کے لیے اس سے محبت ضروری ہے۔ وہ بتاتے ہیں:

تھا ہر اک حب وطن میں اس قدر ڈوبا ہوا تھی نہ کچھ پروا جو بن جاتی کسی کی جان پر
فکر تھی ان کو تو اپنے دیس ہی کی فکر تھی تھا ترقیِ وطن ہی کام تھا کوئی اگر
یہ ترقیِ وطن کا دل میں ان کے درد تھا ہیچ جس کے سامنے تھا درد سر درد جگر
ہر زبان پر تھی وطن کی بہتری کی ہی دعا مانگتا ہر شخص تھا اس کے لیے حق سے اثر
مل کے سب اہل وطن سرسبز کرتے تھے جسے آہ ہمدم تھا ترقیِ وطن ہی وہ شجر

حامد حسن قادری نے اپنی شاعری کے ذریعے وطن کے لیے محض جذباتی برانگیختگی کا ہی

مسالہ مہیا نہیں کیا ہے بلکہ ہر اس جذبے کی مخالفت کی ہے جو قومی ترقی کے منافی تھا۔ مثلاً خود غرضی کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اس کو پروا نہیں ہے اس کی اگر حالت بد — یہ مصیبت میں اگر ہے نہیں کرتا وہ مدد
آخر اے قوم اس خود غرضی کی کوئی حد — ہیچ رحم نہ برادر بہ برادر دارد
ہم کو مطلب ہے کہ مل جائے مزیدار طعام — خواہ فاقے سے کسی بھائی کا ہو کام تمام
ہر بشر کو ہے یہی دھن کہ بنے اپنا کام — ہر کس روز بہی می طلبد از ایام

دن بہ دن مفقود ہوتے جا رہے جذبۂ محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اٹھ گئی دہر سے افسوس محبت یکسر — کوئی اپنا بھی تو لیتا نہیں اپنوں کی خبر
جب یہ ہو کیوں نہ ہو پھر قوم کی حالت ابتر — دختراں راہمہ جنگ است وجدل با مادر

اہل ہنر کی بے قدری کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں ؎

عزت اہل ہنر کی اب کوئی کرتا ہے کہاں — قدر ہوتی ہے ان ہی کی جو ہیں جاہل ناداں
ہے یہی حالت نا قدری ابنائے زماں — اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں

ملک کی ترقی کے لیے اہل ہنر کی قدر دانی کی تلقین اس لیے ضروری تھی کہ اصل میں اسی کی وجہ سے قوم آہستہ آہستہ ماضی کے عظیم سرمائے اور تاریخ سے نابلد ہوتی جا رہی تھی۔ مغرب کے علوم و فنون، صنعت و حرفت، مال و دولت اور چمک دمک پر ہندوستانی فریفتہ تھے۔ وہ ان کی انسانیت کے قصیدے پڑھتے اور ان کے رسوم و رواج کو قابل تقلید سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایشیائی علوم و فنون، صنعت و حرفت اور رسوم و رواج فرسودہ ہو گئے تھے مگر تاریخ گواہ ہے کہ اسی ہندوستان کی اخلاقیات، روایات، انسانیت اور تہذیب و تمدن کبھی مغربی ممالک کے لیے قابل رشک، یہاں کی سائنس نیوٹن کے لیے مشعل راہ، یہاں کا فلسفہ اور علم و ہنر قابل تقلید تھے۔ یہاں کے حکما اس وقت سے پلڈ پریشر اور اس کے تمام عوارض سے واقف تھے جب مغربی ممالک نے اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ ریاضی میں زیرو اور پوائنٹ کی ایجاد کا سہرا ان ہی نا اہل ہندوستانیوں کے سر ہے۔ چنانچہ حامد حسن قادری نے ہندوستان کے شاندار ماضی پر فخر کرتے ہوئے کہا:

تھا وطن پہلے ہمارا مرجائے علم و ہنر — جائے تہذیب و تمدن علم و حکمت کا مقر
آہ اس میں روشنی حکمت کی تھی پھیلی ہوئی — آہ نور علم سے تھا یہ منور سر بسر
بہہ رہے تھے چہار سو دریائے ذخار ہنر — صنعت و حرفت کی چلتی تھی یہاں باد سحر

دور دوراں تھا یہاں دنیا کے ہر اک علم کا اور ہی عالم نظر آتا تھا کچھ دیکھو جدھر

ایک دوسری نظم ''میری قوم'' میں وہ قوم کی عظمت پارینہ کو کچھ اس طرح یاد کرتے ہیں ؎

اے مری قوم مرے جان وجگر سے بڑھ کر ایک دن جہان میں تو شوکت کا اک نشاں تھی
جھکتی تھیں ترے آگے دنیا کی ساری قومیں تو مہر تھی چمک میں رفعت میں آسماں تھی
کان فنون وجان جملہ علوم تھی تو سب اہل علم وفن کی تو دل سے قدرداں تھی
حرفت کے تو نے دریا ہر سو بہا دیے تھے پھولوں کا صنعتوں کے تو ایک گلستاں تھی
پاتی تھیں فیض تجھ سے دنیا کی ساری قومیں اے قوم ہر زبان پر تیری ہی داستاں تھی
سرسبز اور شاداب گلستاں تھا تیرا سارے جہاں پر جب چھائی ہوئی خزاں تھی
کرتی تھیں رشک تجھ پر دنیا کی ساری قومیں لیتی دل وجگر میں تو سب کی چٹکیاں تھیں

مگر سامراجی طاقتیں جو تجارت کے ذریعے ہندوستانیوں کے معاملات میں دخیل ہوئی تھیں اور ان کی قسمت کی مالک بن گئی تھیں انہوں نے لوٹ کھسوٹ اور ظلم وبربریت کا وہ کھیل کھیلا کہ تہذیب وتمدن اور علم وہنر کے تمام سوتے بند ہو گئے تھے۔ حامد حسن قادری اس صورت حال پر کف افسوس ملتے ہوئے بیان کرتے ہیں ؎

آہ لیکن علم کا تو نام بھی عنقا ہے اب آج آتی ہے ہمیں ادبار کی صورت نظر
آہ اب اہل وطن کو ہے تنفر علم سے علم سے کرتے ہیں اب اہل وطن بالکل حضر
سیکھنا تو اک طرف اب نام تک لیتے نہیں آہ اب وہ علم سی شئے میں سمجھتے ہیں ضرر
ہے یہی باعث کہ ہیں قعر جہالت میں پڑے ہے یہی باعث جو کچھ ہم کو نہیں اپنی خبر
آہ تھوڑے ہی دنوں میں ہو گئے ہم کیا سے کیا کیا ہوا وہ علم اب اور اڑ گیا وہ فن کدھر
پہلے گر دولت برستی تھی تو اب افلاس ہے اب جہالت ہر طرف ہے پہلے تھا علم وہنر

اس جہالت کی بدولت مذہب شدت پسندی، بے جا رسوم پرستی اور خلاف عقل عقیدوں کی پابندی نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ سائنٹفک سوچ اور منطقی طرز استدلال کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اصلاح پسند قوم کو اس صورت حال سے ابھارنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ متعدد تحریکیں سرگرم عمل تھیں۔ ادبا اور شعرا بھی اپنی آتشیں تخلیقات سے سامراجی طاقتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ملک کی دگرگوں ہوتی حالت بیان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے تھے۔ مگر افسوس یہ تھا کہ وہ طبقہ جس کی اصلاح کے لیے یہ کوششیں کی جا رہی تھیں وہ انہیں انگریزوں کا پٹھو سمجھ کر دور بھاگنے

کی کوشش کر رہا تھا۔ لہٰذا رفتہ رفتہ نظریات کی غیر پختگی اور یقین کی کمی کے سبب معاشرے میں لغو باتوں پر یقین کا چلن عام تھا۔ سنسنی خیز خبروں، ماورائی طاقتوں کے عمل دخل حتیٰ کہ خواب کے کارناموں کو بھی لوگ غور سے سنتے تھے۔ چنانچہ اصلاح پسند ادیب بھی خوابوں کے سہارے اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حامد حسن قادری نے بھی اپنی ایک نظم ''وطن کی حالت'' میں اس نفسیاتی حربے کا کامیاب استعمال کیا ہے اور خواب میں ہوئے مذاکرے کو اس طرح منظوم کیا ہے ؎

نہایت فکر تھی تھا سخت حیراں — میرا سینہ تھا گنج راز پنہاں
کہ اتنے میں یکا یک لگ گئی آنکھ — نظر آیا عجب خواب پریشاں
وطن پیارے کو اس صورت میں دیکھا — شکستہ حال، غمگیں، چشم گریاں
نہ باقی جس میں طاقت رہی ہے — نہ وہ سیرت نہ وہ صورت رہی ہے
بہت ہی رنج وغم میں مبتلا ہے — مصیبت دوست ہے درد آشنا ہے
کبھی تکتا ہے حسرت سے فلک کو — کبھی میری طرف کو دیکھتا ہے
رواں آنکھوں سے ہے اشکوں کا دریا — زباں پر درد وغم کا ماجرا ہے
تنزل کا اسے ماتم بہت ہے — میرے پیارے وطن کو غم بہت ہے

ملک وقوم کی اس تباہی و بربادی کی تمام تر ذمہ دار ہماری کاہلی، آرام طلبی اور عیش پرستی تھی۔ سربراہان مملکت اپنی جوانیوں کو ملکی ترقی اور پیسوں کو دفاعی منصوبوں میں خرچ کرنے کی بجائے رقص وسرور کی محفلوں میں اڑاتے تھے۔ خود تاج دار ہند کی فعالیت کا یہ عالم تھا کہ جوتا پہنانے والے خادم کی عدم موجدگی کے سبب انگریز افسروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ خود غور کیجئے کہ جس قوم کے حاکموں کا یہ حال ہو اس کی رعایا کا مقدر پستی اور غلامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ حامد حسن قادری نے قوم کی اسی بے عملی پر آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا ؎

نہیں حب وطن کا نام باقی — نہیں پہلے سے اب ایام باقی
نہیں ہے اب دلوں میں شوق محنت — نہیں اب کچھ بھی ذوق کام باقی
لگے ہیں جی چرانے کام سے سب — اگر کچھ ہے تو ہاں آرام باقی
ترقی کی ذرا پرواہ نہیں ہے — انہیں فکر اپنی کچھ اصلاً نہیں ہے

یہاں اس بات کی وضاحت بھی بے جا نہیں ہے کہ سازشی عناصر مذہب بالخصوص اسلامی، فلسفے، قناعت پسندی اور بے ثباتی دنیا کو موضوع بنا کر یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ مادی ترقیات مذہبی

فلسفے کے خلاف ہیں تا کہ وہ عمل پر خلوت نشینی کو ترجیح دیں اور ان کے سیاسی عزائم میں مزاحم نہ ہوں۔ حا مد حسن قادری مذہب کی اصل روح سے واقف تھے۔ ان کے نزدیک دین اور دنیا دو متضاد کنارے نہیں بلکہ دنیا ہی میں ایک مخصوص طریقے پر زندگی گذارنے کا نام دین تھا۔ لہٰذا وہ قوم کو مین اسٹریم میں شامل رکھنے کے لیے فکر دین اور دنیا دونوں کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

پھنسے ہیں یہ تنزل کے بھنور میں — بڑے آرام سے بیٹھے ہیں گھر میں
نہ فکر دین و دنیا ہے نہ کچھ غم — ترقی ہیچ ہے ان کی نظر میں
کریں کوشش تو یہ اڑنے لگیں پھر — ابھی طاقت نہیں ہے بال و پر میں

حامد حسن قادری کے نزدیک بے عملی کی زندگی سے موت بہتر تھی۔ انہوں نے با قاعدہ ایک پوری نظم ''کام کرو یا مر جاؤ'' تخلیق کی تھی جو اگر چہ جنگ بلقان کے تناظر میں تھی مگر اس میں عمل کی تلقین قابل دید ہے۔ مثلاً

اب ہوش میں اے یارو آؤ — کچھ کام بھی کر کے دکھلاؤ
مشکل سے نہ ہر گز گھبراؤ — بے کار نہ ہر گز کہلاؤ یا کام کرو یا مر جاؤ
اب گر کے ابھرنا بہتر ہے — مشکل سے نہ ڈرنا بہتر ہے
کیا کام نہ کرنا بہتر ہے؟ — اس جینے سے مرنا بہتر ہے

یا کام کرو یا مر جاؤ

اس عہد کی سماجی زندگی پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ چنانچہ حامد حسن قادری براہ راست مذہب کے فروغ کے لیے عمل کو لازمی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خدمت بحر اسلام کرو — اسلاف کا روشن نام کرو
گر چاہتے ہو آرام کرو — کچھ کام کرو کچھ کام کرو

وہ مزید کہتے ہیں کہ خالق کائنات نے تمہیں پیدا ہی عمل کے لیے کیا ہے۔ مثال دیکھئے ؎

حق نے ہیں تم کو ہوش دیئے — کچھ تم نے بھی ان سے کام لیے
کچھ کام کرو دنیا کے لیے — بے کار جئے تو خاک جئے

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اللہ اسی قوم کی حالت بدلتا ہے جو کوشش کرتی ہے۔ اس مفہوم کو اردو کے بیشتر شعرا نے نظم کیا ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرنے کے مختلف طریقے استعمال کیے ہیں مگر حامد حسن قادری نے اپنے ایک بند میں جس طرح مشہور محاورے کا 'تڑکا' لگا کر اس کا رنگ دو آتشہ کیا

ہے اس کی مثال نایاب تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

جس نے نہ خبر اپنی آپ نہ لی اس قوم کی کشت فلاح جلی
محنت سے کھلی راحت کی کلی بے کاری سے بیگار بھلی

علم نفسیات کے فروغ نے بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل کیا ہے۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جب کوئی فرد یا قوم عرصۂ دراز تک کسی مخصوص نہج پر زندگی گذارتی ہے تو وہ ان کی عادی ہو جاتی ہے اور اس پر ایسا نفسیاتی دباؤ قائم ہو جاتا ہے کہ ان سے باہر نکلنا اسے ناممکن نظر آنے لگتا ہے۔ انگریزوں کی بالادستی نے بھی ہندوستانیوں کو ایسا مرعوب کر دیا تھا کہ وہ ان کے پنجہ استبداد سے نکلنا ناممکن سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ان کے خلاف لام بند ہونے کی بجائے اپنے انفرادی مسائل میں الجھے رہتے تھے۔ چنانہ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

زندہ رہے کوئی یا کہ مرے تم رہتے ہو ان جھگڑوں میں پڑے
جو قوم جھپٹ کر کام کرے تم بیٹھو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے

ہر عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد عروج فطرت کا اٹل قانون ہے مگر اس کے لیے نتائج سے نہ ڈرنا اور مشکلات کا سامنا کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

اب گر کے ابھرنا بہتر ہے مشکل سے نہ ڈرنا بہتر ہے
کیا کام نہ کرنا بہتر ہے اس جینے سے مرنا بہتر ہے

حامد حسن قادری عروج و زوال کے یکے بعد دیگرے آنے میں بھی ایک نکتہ تلاش کر لیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دراصل زوال تبھی آتا ہے جب انسان عروج کے سراب میں مبتلا ہو کر عمل چھوڑ بیٹھتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں ؎

جو کام سے جان چراتا ہے اس پر ادبار آ جاتا ہے
کیوں کام سے دل گھبراتا ہے ہاں کام ہی بس کام آتا ہے

مختصر یہ کہ حامد حسن قادری نے مختلف مثالوں اور پیرایۂ اظہار کے نت نئے طریقوں سے باشندگان ملک میں عملی اسپرٹ پیدا کرنے اور وطن کی ترقی کے لیے انہیں لام بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

☆☆☆

Akhtar Husain jaafri : Bahaisiyat Jadid Nazm Nigaar by Dr. Bilal Ahmad Wani (Kulgam, Kashmir) cell- 8803071524

ڈاکٹر بلال احمد وانی (ساکنہ بچرؤ کولگام کشمیر)

اختر حسین جعفری بحیثیت جدید نظم نگار

اختر حسین جعفری ۵ راگست ۱۹۳۲ء میں ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد محمد علی مال میں قانون گو تھے ابتدائی تعلیم ہوشیار پور میں حاصل کر کے وظیفے کا امتحان پاس کیا اسی دوران والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے دادا شاہ محمد کے پاس گجرات چلے آئے اور پانچویں سے دسویں جماعت تک کی تعلیم گجرات سے ہی حاصل کی۔لیکن تقسیم ہند کے بعد ان کے والد گجرنوالہ آ گئے لیکن اختر حسین جعفری گجرات میں ہی مزید تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس طرح ۱۹۴۹ء میں زمیندار کالج سے انٹر کیا۔

۱۹۵۰ء میں ترقی پسندوں کے ساتھ تعلقات کی بنا پر انہیں کالج سے نکال دیا گیا گریجویشن کے بعد محکمہ تعلیم میں لکچرر سے منسلک ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے کلکٹر کے عہدے تک پہنچے انہیں جدید نظم نگاروں میں اہم مقام حاصل ہے۔۔انہیں بیسویں صدی کا غالب کہا جاتا ہے۔لیکن ان کو نظم گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔ان کے مجموعہ ''آئینہ خانہ'' کو اردو شاعری میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ان کے ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔جو بہت مشہور ہے۔

دل جہاں بات کرے دل ہی جہاں بات سنے
کار دشوار ہے اس طرز میں کہنا اچھا

اختر حسین جعفری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں اچھے شاعر تو بہت ہیں مگر ان میں سے صاحب اسلوب شاعر اختر حسین جعفری ہیں۔ اور اس کا اسلوب سراسر اس کا اپنا ہے۔یکا یک ایسا اسلوب جس سے نہایت اعتماد سے مستقبل گہرا اسلوب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (فلیپ آئینہ خانہ)

اسلوب بیان کے ضمن میں ان کے نام کلام انتخاب ہے اور اس سر یار انتخاب کلام میں

سے چند نمونے دیکھیں:

تپش گلزار تک پہنچی لہو دیوار تک آیا　　چراغ خود کلامی کا دھواں بازار تک آیا
ہوا کاغذ مصور ایک پیغام زبانی سے　　سخن تصویر تک پہنچا ہنر پرکار تک آیا
عبث تاریک رستے کو تہ خورشید خاں رکھا　　یہی تار نفس آزار سے پیکار تک آیا
عجب چہرہ سفر کا تھا ہوس کی زرد پانی میں　　قدم دلدل سے نکلا تو خط رفتار تک آیا

اختر حسین جعفری نے آزاد نظم کی روایت کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔لیکن بعض نظموں میں بغیر قافیہ و ردیف کے اہتمام کو دکھایا ہے۔اور اس طرح ان کے نظموں کی انفرادیت واضح ہوگئی ہے جیسے ؎

اٹھائے کون حجابات شاہد و مشہود　　کہاں کس پہ طلسم میں نگاہ کھلا
بتائے کون کہ کاغذ کی سطح خالی پر　　بغیر حروف بھی نقطہ وجود رکھتا ہے

اختر حسین جعفری نے کلام میں ایسے منفرد اور انوکھے استعارے اور جدید تشبیہیں استعمال کیں ہیں جو ہمیں مستقبل میں ان کے کلام سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔مثال کے طور پر ان کے کلام کے کچھ سطور پیش کر رہا ہوں ملاحظہ کیجئے۔ان میں کیسے کیسے استعارات اور تشبیہات آئی ہیں:

پیام جتنے صبا نے دیئے غلط نکلے　　کہا جو موجِ آب رواں نے جھوٹ کہا
سفر کا رنج وہی زیر ہازمین وہی　　وہی جو کھڑے باہوں میں دیکھ چکے

اختر حسین جعفری کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ نہایت مختصر بحر استعمال کر کے اپنی بات کہہ جاتے ہیں ان کی ایک نظم ہے ''پہچان کی ابتداء'' یہی نام انھوں نے اپنی کتاب آئینہ خانہ کے آخری حصّے کے لئے بھی منتخب کیا ہے۔جس میں صرف نظمیں ہیں۔انھوں نے اپنی نظم نگاری میں ایک انوکھی طرح ڈالی ہے اس طرح وہ اپنا خاص رنگ جماتے ہیں۔ان کا یہ خاص انداز تحریر یا طرز سخن صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہے نہ صرف یہ کہ ان کا انداز بیان ہی منفرد ہے۔بلکہ تراکیب و الفاظ بھی ایک انوکھے انداز میں، استعمال کرتے ہیں، ان کی ایک نظم ''اک انعام کے کتنے نام ہیں'' ملاحظہ کریں ،اور دیکھیں کہ ان کا انداز سخن کس قدر انوکھا ہے:

اک پہچان کے کتنے اسم ہیں　　اک انعام کے کتنے نام ہیں
تیرا نام وہ بادل جس کا پیغمبر پر دشت و جبل میں سایہ ہے　　تیرا نام وہ پرکھا جس کا رم جھم پانی
وادی میں دریا کہلائے اور سمندر بنتا جائے　　تیرا نام وہ سورج جس کا سونا سب کی ملکیت ہے
جس کا سکہ ملکوں ملکوں جاری ہے

اختر حسین جعفری نے اپنے اظہارِ بیان میں ندرت اور جدت کا نکھار پیدا کیا ہے۔ ان کے کلام میں قدیم روایات کا عکس بھی ہے اور اپنا ایک منفرد انداز بھی بعض لوگ ان کے اس انداز کو فن بھی سمجھتے ہیں لیکن اختر حسین جعفری بقول احمد ندیم قاسمی وہ ان روایات کی چربہ سازی کے بجائے ان کا رس نچوڑ لیتے ہیں۔ ''کربلا'' کے موضوع پر قدیم و جدید شعراء نے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے مگر اختر حسین جعفری نے ''کربلا'' پر جو چھ شعر بھی جو لکھے ہیں وہ ان کی ندرت اظہار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

علم ہوئے جہاں استخواں زمینوں میں مجھے تلاش کر حرف ان دفینوں میں

اختر حسین جعفری نے اپنی شاعری میں جو جدت کی بلیغ مثال پیش کی ہے وہ اردو شاعری کی ایک منفرد چال ہے اور اردو شاعری کی رنگینیوں میں ایک عمدہ مثال ہے۔ زمانہ حال میں ہی نہیں۔ بلکہ مستقبل میں ان کی شاعری کی فنی و فکری خوبیاں جگمگاتی رہیں گی۔ قدیم کو جدید شعراء نے اپنے دوستوں اور محبوبوں کے لئے مختلف انداز میں خراج و تحسین لکھے ہیں۔ لیکن اختر حسین جعفری کا جدید و بلیغ انداز بیان یہاں دیکھیں کہ کس قدر عمدہ دار ملبغ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے لئے جو نظم انہوں نے لکھی وہ جدت و بلاغت کا حسین وقع ہے:

''وہ جو تجھ سے پہلی کی راہ تھی'' قائداعظم محمد علی جناں کے لئے:

وہ جو تجھ سے پہلے کا ذکر تھا وہ جو تجھ سے پہلے کی راہ تھی
کہیں صبح رت لئے ہوئی کہیں شام عشق بجھی ہوئی
کہیں در پہر ماندگاں پہ تنی ہوئی کہیں چاند پچھلے وصال کے
کہیں مہر صبح کمال کے کہیں زلف وصل مزاج پر نہ گرد ہجر جمی ہوئی

اختر حسین جعفری کا ایک اہم وصف انسان کی انسانی جذبات کی تہذیب ہے۔ اس کی محنت ہو یا اس کی فتح و شکست اس کی نظریاتی وجود ہو یا احتجاج نہایت تہذیب یافتہ ہیں اور بے نظیر و بے مثال ہے۔ اور دگرد کی علامتیں اپنی شاعری میں خوب استعمال کرتے ہیں اور آس پاس کی حقیقتیں بیان کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا خیال ہے کہ:

''پھر اختر حسین جعفری اپنی علامتوں کا انتخاب اپنی ہی تاریخ و تہذیب ایسے ہی عقائد و نظریات اپنے ہی رسم و رواج کرتا ہے اس مقصد کے لئے اس سے سمندر کو پار کرنا پڑے جو کچھ ہم پہ گذر چکا ہے اور جو کچھ گذر رہا ہے، وہی اختر حسین جعفری کی علامتوں کا ذخیرہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری کی تمام علامتیں ہماری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کے بہت قریب ہوتی ہیں۔ اور روح

عصر کی ایک ایک سطر ایک ایک لفظ میں جھانکتی نظر آتی ہیں۔اختر حسین جعفری کی زبان بہت اچھوتی ہے۔ان کی نظموں کا مطالعہ رکرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان کے کلام پر فارسی کا گہرا اثر ہے کہ ان کی لفظوں میں فارسی الفاظ کے تراکیب ملتے ہیں لیکن جعفری نے ان کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہیں مثال کی جھلک ان اشعاروں میں دیکھئے:

عصا بدست کشیدہ نقاب لب بستہ　　یہ کس امید کے رشتے بر ملا ہے مجھے
نشان پاس سے سراغ بدن نکالے گا　　سفر کی رات تقاقب میں ہے سگ سُیور

اقتساب اقبال شمیم ان کے کلام پر عجیبی چھاپ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اختر حسین جعفری کی ڈکشن پر عجیبی چھاپ بڑی گہری ہے لیکن ترتیب سازی میں طباعی اوراخلاقیت کا کرشمہ ہے۔ جو ہمیں ان کے ہاں نظر آیا ہے۔اور جس طرح وہ زور تراکیب اور بند سے احساس کو رسائی اور دور دراز منتطفول میں لے جاتا ہے۔اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔اس نے اپنے معجزہ فن سے علامت بنادیا ہے۔''

اختر حسین جعفری کی نظم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں تغزل کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ جعفری ایک صاحب اسلوب شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے نظموں میں ایسے مصرعے کہے ہیں کہ جن پر غزل کے مصروں کا گمان بنتا ہے اس لئے ان کی بطرا غزل سے قریب ترین محسوس ہوتی ہے۔

بقول ضیاءالدین ضیاء

''جدید نظم میں اس نے جس اسلوب کی بنیاد ڈالی اور شاعری میں اس سے پہلے اس کی مثال موجود ہیں ۔بقول محمد علی صدیقی:

''اختر حسین جعفری کا مجموعہ'' آئینہ خانہ'' شعری فن پاروں کی ایک ایسی گہری ہے جو ہم عصر اردو شاعری کی اعلیٰ پختگی اور اپنے حسین لسانی پیکروں کے لئے جدید اردو شاعری کے لئے سرمایہ افتخار ٹھہرے گا''۔

☆☆☆

Tarannum Reyaz ke Afsanon ka Mauzuaati mutalea by Talib Hussain

Dar(research scholar dept. of urdu Panjabi University Patiala

طالب حسین ڈار (ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ)

ترنم ریاض کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

ترنم ریاض کا نام وادیٔ کشمیر کی نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں میں سرفہرست ہے۔اس کے علاوہ ان کا شمار ملک کی اہم خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے افسانے ادبی ومعیاری ہونے کی وجہ سے ملک کے مشہور ومعروف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے تھے۔ان کی تخلیقات کو دنیائے ادب میں کافی سراہا گیا۔ترنم ریاض نے ۱۹ اگست ۱۹۶۳ء کو سرینگر میں پیدا ہوئی۔آپ کا اصلی نام فریدہ تھا لیکن ادبی دنیا میں ترنم ریاض کے نام سے جانی جاتی ہے۔آپ کے والد کا نام چودھری محمد اختر خان ہے۔ترنم ریاض نے ابتدا سے اعلیٰ تعلیم تک کا سفر کشمیر میں ہی طے کیا۔ابتدائی تعلیم گرلز ہائی اسکول کرن نگر سرینگر سے حاصل کی۔بی اے کی ڈگری زنانہ کالج سرینگر سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔یونیورسٹی آف کشمیر سے ایم اے اردو ،بی ایڈ اور ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔انہوں نے ۱۹۸۳ء میں ریاض پنجابی سے اپنی ازدواجی زندگی کا سفر شروع کیا۔

ترنم ریاض کی شخصیت کو اللہ نے ایسے حسن اور ذہانت سے نوازا تھا کہ اُن کی عظمت میں داخل ہونے والوں کی گردنیں عزت واحترام سے جھک جاتی ہیں۔خوبصورت چہرہ، درمیانہ قد، پرنور آنکھیں اور بات کرنے کا ڈھنگ ایسا کہ لفظوں سے موتی بکھرنے لگتے تھے اور آواز اس قدر میٹھی کہ ہر کوئی ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ترنم ریاض ایک خلیق اور ملنسار خاتون تھی۔نرم وشریں گفتگو سے وہ لوگوں کا دل جیت لیتی تھی۔ادبی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ ترنم ریاض گھریلو فرائض کو بھی بخوبی نبھاتی تھی۔

ترنم ریاض ہمہ گیر شخصیت کی مالک تھی۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعرہ، محقق، نقاد اور مترجم بھی تھیں۔اگر چہ انہوں نے شعروادب کے مختلف شعبوں میں خوب طبع آزمائی کی تھی۔لیکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار تھی۔ترنم ریاض نے اپنی ادبی زندگی کا

آغاز ۱۹۷۳ء میں کیا۔اُن کی پہلی کہانی روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ترنم ریاض نے مڑکر واپس نہیں دیکھا اوران کا ادبی سفر مئی ۲۰۲۱ء تک جاری رہا۔ان کی کہانیاں اور دیگر مضامین ہندو پاک کے موقر ومعیاری اخبارات ورسائل کی زینت بنتی رہیں۔

جن میں ''شیرازہ'' (کلچرل اکیڈمی سرینگر)،''شعر وحکمت'' (حیدرآباد)،''چہار سو'' ،شاعر''،ایوان اردو'' (دہلی)،''صدا'' (لندن)،''تخلیق'' (لاہور)،''افکار'' (کراچی) ''نیرنگ خیال'' (لاہور)،''پنج دریا'' (جالندھر)،''جدید ادب'' (جرمنی) وغیرہ قابل ذکر رسائل وجرائد ہیں۔ ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں کافی داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔جن میں ''یہ تنگ زمین'' (۱۹۹۸)،''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' (۲۰۰۰)،''یمبر زل'' (۲۰۰۴)،''میرا رخت سفر'' (۲۰۰۸)،''نرگس کے پھول'' اور''صحرا ہماری آنکھوں میں'' قابل ذکر ہیں۔افسانوی مجموعوں کے علاوہ دو ناول''مورتی'' (۲۰۰۴) اور''برف آشنا پرندی'' (۲۰۰۹) تحقیق وتنقید کی دو کتابیں''بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب'' اور''چشم نقش قدم'' اور شعری مجموعوں میں پرانی ''کتابوں کی خوشبو''،''بھادوں کے چاند تلے'' اور''زیر سبزہ محو'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ترنم ریاض کی متعدد ادبی انجمنوں اور تنظیموں نے ان کی ادبی خدمات کے عوض اعزازات وانعامات سے نوازا ہے۔ جن میں یوپی اردو اکادمی ایوارڈ، دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، کلچرل اکاڈمی ایوارڈ، ساحرا اکاڈمی لدھیانہ ایوارڈ وغیرہ قابل ذکر ہیں درس وتدریس کے علاوہ وہ برقی میڈیا سے وابستہ تھی اور آل انڈیا ریڈیو میں بطور نیوز ریڈر کام سرانجام دیتی تھی۔ترنم ریاض ۲۰ مئی ۲۰۲۱ء کو رونا انفیکشن کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

ترنم ریاض کا شمار عہد حاضر کے اہم اور نمائندہ افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔اُن کا شمار اُن فنکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو نئی جہتوں اور نت نئے تجربوں سے روشناس کیا۔ وہ اکثر نئے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرنے کے بعد ان موضوعات کو آپ بیتی اور جگ بیتی میں مدغم کر کے ایک نئے روپ، ایک نئے انداز سے افسانوں میں پیش کرتی تھی۔انہوں نے صنعتی شہروں کی گنجان آبادیوں میں نئے پیچیدہ مسائل سے جھوجھتے ہوئے انسانوں کا قریب سے مشاہدہ کیا اور ایسے موضوعات کو بھی چھیڑا جو شاید کشمیر میں رہ کر ان کے تخلیقی تخیل کا حصہ نہ بن سکتے تھے۔تنہائی، اجنبیت، بے گانگی، عورتوں کے مسائل، نسائی نوعیت کے موضوعات، شکست روابط اور اس طرح کے کئی موضوعات جو ان کے افسانوں میں جا بجا ملتے ہیں۔اردو فکشن کے معتبر نقاد وارث علوی نے اپنی

کتاب ''گنجفہ باز خیال'' میں لکھا ہے:۔

'ترنم ریاض ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہیں۔ترنم ریاض کے یہاں اچھے افسانے اتنی وافر تعداد میں ملتے ہیں کہ ہمواری اور ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ترنم ریاض کی ایک بڑی خوبی ان کی فن کارانہ شخصیت کی سادگی ہے۔ان کے یہاں (Artistic Pretensions) کوئی نہیں، کوئی بلند بانگ دعوے نہیں، کوئی تکنیک کی طراریاں نہیں۔کہیں نظر نہیں آتا کہ استعارے، علامتیں اور اساطیر مُنہ میں سوکینڈل پاور کا بلب لیے جلوہ افروز ہیں۔ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے۔''(۱)

ترنم ریاض اپنی کہانیوں کے موضوعات کے انتخاب میں بہت محتاط نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں عصری زندگی کی عکاسی نیز اکیسویں صدی کی جدید تہذیب سے وابستہ مسائل کی نقاب کشائی بھی ملتی ہے۔ان کے موضوعات مین تنوع اور سادگی ہے۔وہ فنی چابکدستی سے موضوع کو بکھرنے نہیں دیتی۔وہ مختلف النوع واقعات کو اپنا موضوع بنا کر قاری کو تحیر، تجسس، تازگی اور تہہ داری، تڑپ اور ترسیل کے متنوع عناصر سے لطف ولذت عطا کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں جہاں شعلۂ حیات کی حرارت ہے جذبات کی تمازت ہے وہیں تہذیب وشائستگی کی شرافت بھی مضمر ہے جو ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کا بین ثبوت ہے۔اُن کے افسانوں کی فضا مانوس ہے۔اسی فضا سے وہ علامتیں اور اشارے بھی چنتی ہیں۔وہ جہاں ازدواجی زندگی پر لکھی گئی کہانیوں میں ایک ماہر نفسیات کی طرح باریک نکتوں پر فلسفیانہ بحث کرتی نظر آتی ہیں وہیں طبقاتی کشمکش، عصری انتشار اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کو افسانہ کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ظلم و جبر اور تشدد کے پس منظر میں لکھے گئے ان کے افسانے آشوب نامے سے کم نہیں۔کشمیر باسی ہونے کے سبب ان کی کہانیوں میں ایک خاص مقامی رنگ ملتا ہے لیکن ان کی کہانیوں کے موضوعات محدود نہیں ہیں بلکہ وہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے حالات و واقعات کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی تھی۔انہوں نے جن موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے ان میں ماں کی ممتا، گھروں میں صدیوں سے چلی آرہی ساس اور بہو کے بیچ اختلافات، عورت کا جنسی اور نفسیاتی استحصال، بچوں کی محرومیاں، جانوروں کی محرومیاں، دیہاتی اور شہری زندگی کا موازانہ، زندگی کی کشمکش، عوام کا درد وکرب، عسکریت پسندی سے متاثر زندگیاں اور دور حاضر کے مقامی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل وغیرہ جیسے موضوعات کی تصویر کشی ملتی ہیں۔ان کے افسانوں میں گھر اور اس کے اندر ہونے والے واقعات و حادثات کی تصویر واضح طور نظر آتی

ہے۔ چاہئے وہ ''خواتین حضرات'' کی سندری اور عاصمہ بیگم ہوں ''رنگ'' کی ماں یا ''باپ'' کا باپ ہو غرض سب کا اپنا اپنا درد ہے، اپنے اپنے مسائل ہیں جسے منصفہ نے اپنے افسانوں میں ابھارا ہے۔ وہ ماحول کی شدت کو نہ صرف ابھارتی ہے بلکہ واقعہ کے ساتھ ساتھ کردار کے داخلی اور خارجی کیفیات پر بھی اپنی نگاہ رکھتی ہیں۔ ذات کا کرب وانتشار جنس کی پامالی، مختلف فکری روز کا باہمی ٹکراؤ اور آمیزش کے غیر فطری عوامل، فطرت کی آزاد سے فرد کی بے ربطی ان کے افسانوں میں سمٹ آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر میں پچھلے بیس تیس سال سے جو حالات بنے ہوئے ہیں ان حالات کا عکس بھی ان کی کہانیوں میں صاف جھلکتا ہے۔ عتیق اللہ ترنم ریاض کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

''ترنم ریاض کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ کسک ہے جسے ایک ٹیس کی طرح ان کے افسانوں کے بطن میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ان افسانوں کا ماحول اور سارو سیاق بے حد خاموش آگیں ہے لیکن اسی خاموشی کے اندر جو بلا کا شور برپا ہے اسے ان کا قاری بہت محسوس کر لیتا ہے۔ ترنم ریاض میں چیزوں کو ان کے اندر اتر کر دیکھنے کی جو صلاحیت ہے وہ ایک افسانہ نگار کے لیے بڑی نیک فال ثابت ہوئی۔'' (۲)

ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں کشمیری زندگی، اس کا کرب اور مسائل کو فنکارانہ انداز سے ابھارا ہے۔ افسانے ''متاع گم گشت''، ''بابل''، ''برف گرنے والی ہے''، ''میرا پیا گھر آیا'' میں گھر آنگن کی زندگی نمایاں ہے ان افسانوں میں اس کسک اور ٹیس کو با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے جو کشمیری عوام کی زندگی ہے۔ افسانہ بیمبر زل سے اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ٹھہرے ہوئے بندوق بردار کے سامنے سے پہلی گاڑی کے گزرتے ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس میں آگ لگ گئی۔ پیچھے کی گاڑیاں توازن کھو کر ادھر اُدھر بکھرنے لگیں۔ ان کے حفاظتی عملے نے چند لمحوں کے اندر اندر چاروں طرف اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ٹیلیفوں بوتھ والے نے اندر سے دکان کا شٹر گرا دیا تھا۔ دلوّ کے علاوہ دو اور لوگ بھی دکان کے اندر گئے تھے۔ اب شاید کرفیو لگ چکا ہوگا۔'' (۳)

ترنم ریاض ایک دردمند رکھنے والی حسّاس اور ذہین خاتون افسانہ نگار تھی۔ وہ ایک تجربہ کا رفنکارہ تھی۔ ان کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ ترنم ریاض نے افسانہ نگاری کی مشاہیر سے ہٹ کر اپنی ایک جداگانہ راہ اختیار کی ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ ترنم ریاض کے افسانوں کے موضوعات کچھ الگ یا ہٹ کر نہیں ہیں بلکہ عام زندگی کے، گھریلو

زندگی کے موضوعات، ازدواجی زندگی میں پیار کرنے والے بھی اور ظالم شوہر بھی، بھائی بہن، ساس بہو، ماں کی ممتا، گھریلو ملازم، باہمی غلط فہمیاں اور ایسی کئی باتوں سے متعلق کرداروں کو ترنم ریاض نے اپنے قلم کی زینت بنایا ہے۔ ترنم ریاض نے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح عورت کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ گھریلو زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات وحادثات اور مسائل کو انہوں نے نہایت فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سنجیدگی کا اثر کہانی میں برابر قائم رہتا ہے۔ ان کی تحریروں میں عریانیت یا فحاشی نہیں ملتی ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں ایک مقصد اور پیغام پوشیدہ ہوتا ہے جس کو وہ اپنے افسانوں کے زریعے قارئین تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے بہت سی کہانیاں لکھی اور اس بات کو عیاں کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح سماج میں عورت کے ساتھ ناانصافیاں ہوتی آئی ہیں۔ انہوں نے عورتوں کی نفسیات کا نہایت عمیق مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے اور اپنے تمام مشاہدوں اور تجربوں کو افسانوں میں بروئے کار لایا ہے۔ ان کی ہر تحریر ہمیں گھریلو ماحول اور معاشرے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ ''یہ تنگ زمین'' میں افسانہ نگار نے ایک ماں کی ممتا کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس کی ممتا نہ صرف اپنے بچوں کے لیے تڑپ اُٹھتی ہے بلکہ دوسرے بچوں کے لیے بھی اس کی ممتا جاگ اُٹھتی ہے۔ افسانے کی کہانی ایک معصوم بچے کے اردگرد گھومتی ہے۔ مصنفہ نے افسانے میں اس بات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ کس طرح آس پاس کا ماحول اور معاشرہ ایک نوعمر بچے کی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ نیز افسانے میں افسانہ نگار نے کشمیر کے موجودہ عہد کے کربناک حالات پر گہرا وار کیا:۔

''بڑے کمرے کے دروازے پر اس کی منی سی بہن ہونٹوں پر انگلی رکھے پہرا دے رہی تھی ''شی ادھر نہیں جانا فائرنگ ہو رہی ہے۔'' وہ مجھے خبردار کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی اندر جھانکا تو عجیب منظر دیکھا۔ سارے گھر کے تکیے اور سرہانے ایک کے اوپر ایک اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے ریت کی تھیلیاں رکھ کر مورچے بنائے جاتے ہیں۔ وہ درمیان میں اوندھا لیٹا ہوا ایک بڑی سی لکڑی کو بندوق کی طرح پکڑے منہ سے مختلف طرح کی گولیوں کی آوازیں نکال رہا ہے اور اس کے دائیں بائیں میرے دونوں بیٹے اپنی پرانی چھوٹی چھوٹی پلاسٹک بندوقیں لیے ہوئے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ سمجھی۔۔۔۔ کی آڑ میں ہو کر دوسری طرف کودتا کبھی دوسری الماری کے پیچھے چھپ کر جست لگا کر دیوار کے ساتھ چپک جاتا اور وہ خود مورچے سنبھالے کبھی ان کو ہدایت کرتا کبھی ان پر بندوق تان دیتا اب یہی اس کا پسندیدہ کھیل تھا'' وہ میٹھی بولیاں، وہ رقص، وہ موسیقی۔۔۔۔ بھول گیا تھا اور وہ سب

یاد دلانے کے لیے میں شاید اسے کہیں نہیں لے جا سکتی تھی۔'' (۴)

افسانہ ''اماں'' میں افسانہ نگار نے آج کے دور میں بوڑھے ماں باپ کے ساتھ کیے جانے والے سلوک اور رویہ کی حسین تصویر کشی کی ہے۔ مصنفہ نے واضح کیا ہے کہ کس طرح ماں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہے، کتنی تکلیفیں اور پریشانیاں اُٹھاتی ہے لیکن جب یہ بچہ جوان ہو جاتا ہے تو تمام چیزوں کو بھول کر اس چند دنوں کی زندگی کا غلام بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اماں جیسی عورت جو زندگی بھر مصیبت جھیلتی رہتی ہے اور کچھ پل سکون کی زندگی جینے کے لیے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ افسانہ ''پورٹریٹ'' میں ساس اور بہو کے بیچ اختلافات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ بہو ہمیشہ اس بات کی خواہش مند دکھائی دیتی ہے کہ اس کی ساس کسی دوسرے کی باتوں میں آئے بغیر اسے اپنی ہمراز بنائے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ دراصل افسانے کے ذریعے مصنفہ نے اُن تمام عورتوں کو پیغام دیا ہے کہ وہ اپنی بہوؤں سے ایسا ہی برتاؤ کریں جیسا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کرتی ہے تاکہ ہمارے معاشرے میں اس طرح کی کوئی عورت جنم نہ لے جس سے عورت ذات کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے اور ساتھ ہی ساتھ اُن تمام بہوؤں کو بھی تلقین کیا ہے کہ صبر و تحمل سے زندگی جینا ہی سب سے بڑی انسانیت ہے:۔

''میں آپ کی بہن بھابی یا بھانجی نہ سہی، آپ کی بہو تو ہوں۔ بہت سے خواب لے کر آئی ہوں۔ آپ کو اپنی امی کی طرح چاہنا چاہتی ہوں۔ ذرا سا مجھ کو بھی اپنوں میں شمار کر لیجئے۔ مجھے نظروں کی زبان نہ سکھائیں تو سہی کہ وہ میرے ہی خلاف تو ایجاد ہوئی ہے اور جب راز داری ہی مجھ سے ہے تو میں ہمراز ہو جانے کی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا خیال کرنے کی جسارت کیسے کر سکتی ہوں'' (۵)

''میرا رختِ سفر'' بھی ترنم ریاض کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ اس میں انہوں نے روہی نام کی عورت کو موضوع بنایا ہے۔ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جاتی ہے جو شراب نوشی اور جوئے بازی جیسی بری عادتوں میں مبتلا ہو کر سارا پیسہ خرچ کر دیتا ہے اور آخر کار بے بس ہو کر گھر میں پڑا رہتا ہے۔ روہی کافی سنجیدہ اور فکر مند عورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس طرح سے وہ ایک فیشن ڈیزائنگ کا ایک شوروم کھولتی ہے اور وہاں دیر رات کام کرتی رہتی ہے۔ اس کے شوہر کو ان کا دیر رات تک کام کرنا پسند نہیں آتا اور بیوی کو کام پر جانے سے روکتا ہے۔ لیکن روہی مسلسل اپنے کام میں لگی رہتی ہے اور پھر ایک رات اس کا شوہر فریب کاری اور مکارانہ کام سرانجام دے اس کا خون کر دیتا ہے اور خود بھی بزدلی دکھا کر خودکشی کر بیٹھتا ہے۔

ترنم ریاض کا افسانہ ''حضرات وخواتین'' میں افسانہ نگار نے گھر کے ملازمین میں ناجائز جنسی تعلقات کو موضوع بنایا ہے جو گھر کی مالکن کے لیے ایک بڑا چیلنج بن جاتا ہے اور پھر وہ کسی طرح ان حالات سے نبرد آزما ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں بڑے شہر میں کام کرنے والی نوکرانی سندری کی کہانی ہے جو گاؤں کی ان پڑھ گوار لڑکی، جسے نہ ڈھنگ سے بولنا آتا ہے، نہ شہری طور طریقے سے واقف ہے لیکن دھیرے دھیرے سب سیکھ جاتی ہے۔ کہانی کا نہ صرف سندری کے جنسی استحصال کو فوکس کیا ہے، جنسی استحصال صرف مالک یا مالک کے بیٹے کے ذریعے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ساتھ میں دیگر کام کرنے والے نوکر بھی استحصال کرتے ہیں۔ ایسے ہی سندری کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

''لے کر کیسے جاؤں گی ہسپتال اسے۔۔ سکینڈل بن سکتا ہے۔ اس بات کا۔۔ اکیلے بھیجوں۔۔ راستے کہاں آتے ہیں اسے۔۔ ڈرائیور کے ساتھ بھیج دوں اسے۔۔ کوئی جرم تو رہا نہیں اب۔۔ اب۔ اب تو لڑکیوں سے شادی کے بارے میں ہی پوچھتے ہیں نہ فی ٹس (foetus) کے باپ کے بارے میں۔۔ قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ابارشن۔۔''(۶)

ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' میں شامل افسانہ ''شہر'' ان کی نمایاں تخلیقات میں سے ایک ہے جس میں زندگی بھر کا علم، تجربہ اور شعور جھلک آیا ہے۔ انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں مختلف قسم کے حادثات و تجربات سے گزرے جس کی وجہ سے فکر و نظر کے حوالے سے بھی کئی موڑ اور پڑاؤ آئے۔ سونو اور ثوبیہ صرف کشمیری کردار نہیں بلکہ آفاقی ہیں۔ اسی لیے اس افسانے میں جو بے رحم حقیقت نگاری آ گئی ہے وہ ان کے فکشن میں کم نظر آتے ہے۔ ان کی سب سے پہلی چیز جو قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ ان کی فنکارانہ شخصیت کی سادگی۔ انہوں نے غربت، جہالت، ضعیف الاعتقادی، جنگ، استحصال اور ہوس زر کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔

''پلاسٹک کی میز پر چڑھ کر سونو نے نعمت خانے کی الماری کا چھوٹا سا کواڑ وا کیا تو اندر قسم قسم کے بسکٹ، نمک پارے، شکر پارے اور جانے کیا کیا نعمتیں رکھی تھیں۔ پل بھر کو وہ ننھے سے دل پر کچوکے لگاتا ہوا غم بھول کر مسکرا دیا۔ اور نائٹ سوٹ کو پونچھ کر اس نے بسکٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور اپنے پانچ سالہ وجود کا بوجھ سنبھالتا ہوا میز سے نیچے اتر آیا۔ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی۔''(۷)

ترنم ریاض کی ذات میں قصہ گوئی کا فطری جوہر، زرخیز تخیل، وسعت مطالعہ کے سبب واقعے اور آدمی کو پرکھنے اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پاس متبسم لہجے میں بہت کچھ کہہ جانے کا ہنر ہے۔ ترنم ریاض کے نام کے ساتھ ہی کشمیر کی جیتی جاگتی،

خالص اور بے ریا، کھری اور کھڑی زندگی کے سچے اور موثر نقشے جاگنے لگتی ہیں۔ ترنم ریاض بلاشبہ جدید اردو افسانے میں ایک رجحان کا نام تھا انہوں نے کہانی کے روایتی سانچے اور اسلوب کے مانوس لہجے کو شعوری طور پر توڑ کر اپنے عصر کی پیچیدہ صورت حال کے اظہار کے لیے نہ صرف نئے فنی وسائل تلاش کرنے کی کوشش کی بلکہ ایک نیا استعارہ بھی وضع کرنا چاہا۔ وارث علوی ان کے بارے میں اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں:۔

''ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے پہلا احساس یہی ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہے لیکن کوئی نقاد ان کی یہ شناخت قائم کرتا نظر نہیں آتا۔ یعنی ایسا لگتا ہے کہ نقاد کے دل میں ایک خوف سا ہے کہ اگر انہوں نے اس خاتون کو دوسروں سے الگ کیا یا بہتر بتایا تو دوسرے ناراض ہو جائیں گے اس لیے عافیت اس میں ہے کی انھیں ساتھ ساتھ ہی چلنے دو یعنی فہرستی ریوڑ سے الگ نہ کرو۔ اس رویے سے دوسرے افسانہ نگاروں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ ترنم ریاض کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ان کی انفرادیت قائم نہیں ہوتی۔''(۸)

افسانہ نگاری میں ترنم ریاض کا اسلوب نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ وہ عام فہم زبان سے اپنے فن کو جلا بخشتی تھی۔ وہ چھوٹے جملوں میں رواں دواں اور آسان الفاظ و محاورات، جذبات و احساسات کی تاثیر میں ڈوبی تصویریں کھینچنے میں ماہر تھی۔ وہ اپنے محسوسات، مشاہدات اور مطالعات کو ان کی اصل شکل میں قارئین تک اس طرح منتقل کرنا چاہتی ہیں کہ ان کے ذہین پر بھی وہی اثر ہو جو فنکار کے ذہن پر ہوتا ہے۔ اس طرح ترنم ریاض کے اسلوب میں اختراع و ایجاز کے پہلو بھی ملتے ہیں۔ تازگی اور شادابی ان کی ہر کہانی میں پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کے ترنم اور جملوں کی طراوت سے ہمارے حواس و اعصاب میں موسیقیت و غنائیت پیدا کر دیتی ہیں اور دل اور دماغ میں توانائی اور طرفگی کا ایک سیل رواں بہا دیتی ہیں۔ جب تک ان کی تحریر ختم نہیں ہوتی قاری اس وقت تک نے چینی محسوس کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کی اپنی موجودگی اس قدر سے محسوس ہوتی ہے کہ افسانہ نگار خود ایک کردار بن جاتا ہے لیکن ہر جگہ گم نام یا راوی کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ مظہر امام ان کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''ترنم ریاض کے افسانوں کی جو فضا ہے وہ بڑی مانوس فضا ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس کے اظہار میں کوئی تصنع آمیز صنائی نہیں ہے، بہت ہی صفائی اور شستگی کے ساتھ وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ کہیں کہیں تا ان کے اسلوب میں خاص طرح کی مقناطیسیت آجاتی ہے جو اپنے ساتھ ساتھ

پڑھنے والے کو بہالے جاتی ہے۔ترنم ریاض اپنی سادگی ، بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتی ہیں۔(۹)

الغرض ترنم ریاض وادیٔ کشمیر کی ایک کہنہ مشق افسانہ نگار تھی۔وہ افسانے کے فن، نزاکت،نفاست،اور تکنیک سے بخوبی واقف تھی۔ان کی تحریروں میں باریک بینی،مشاہدہ کی گہرائی، بلند خیالی،تجربے کی وسعت جیسے عوامل کارفرما ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی سے جڑے رنگارنگ مسائل اور حالات و واقعات کو پیش کیا ہے۔وہ اپنی تخلیقات میں انسانی رشتوں کی پاکیزگی اور دلی جذبات کے تقدس کو نہایت پر اثر اور بامعنی اسلوب میں پیش کرتی ہیں۔وہ سماج اور معاشرے میں پھیلی برائیوں اور بداعمالیوں پر پردہ پوشی نہیں کرتی ہیں۔بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے سے ان کی نقاب کشائی کرتی نظر آتی ہیں۔ان کے افسانے پلاٹ،کردارنگاری،زبان و بیان غرض ہر لحاظ سے کامیاب اور مکمل ہیں۔ان کے کردار کسی دوسرے دنیا کے مخلوق یا باسی نہیں بلکہ ہمارے ارد گرد کے ماحول میں پل رہے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں جن سیاسی، سماجی، معاشی یا معاشرتی مسائل کو پیش کیا ہے۔ان پر ان کی نگاہ بہت عمیق اور گرفت مضبوط رہتی تھی۔اُن کی تقریباً ہر کہانی میں جذباتی ارتعاش کا پہلو ملتا ہے۔وہ(Gender Based) کہانیاں تحریر کرنے سے گریز کرتی تھی بلکہ اُن کے افسانے فرد کائنات کی کہانی معلوم ہوتی ہیں۔غرض اپنے فن پاروں کے ذریعے وہ نہ صرف انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں بلکہ اپنی تخلیقی اپج اور اسلوبیاتی رویوں سے ترنم ریاض نے ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب کو برصغیر کے ادبی معیار پر لا کھڑا کیا ہے۔

حواشی

۱ گنجفہ باز خیال، وارث علوی،ص ۱۲۲

۲ فلیپ ،یمبر زل،ترنم ریاض

۳ یمبر زل،ترنم ریاض،ص ۱۸

۴ یہ تنگ زمین،ترنم ریاض،ص ۱۶

۵ یہ تنگ زمین،ترنم ریاض،ص ۱۸

۶ حضرات وخواتین،مرارخت سفر،ترنم ریاض،ص ۳۳

۷ شہر،ابابیلیں لوٹ آئیں گی،ترنم ریاض،ص ۱۶۸

۸ گنجفہ باز خیال، وارث علوی، ص ۱۲۱

۹ فلیپ، یمبر زل، ترنم ریاض

کتابیات

نمبر	تصنیف	مصنف	ناشر	سال اشاعت
۱	ابابیلیں لوٹ آئیں گی	ترنم ریاض	نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۰۰
۲	گنجفہ باز خیال	وارث علوی	ماڈرن پبلیشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۰۷
۳	مرارخت سفر	ترنم ریاض	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۰۸
۴	یمبر زل	ترنم ریاض	ماڈرن پبلیشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۰۴
۵	یہ تنگ زمین	ترنم ریاض	نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۹۸

☆☆☆

Dr.Tahir Taunsvi bahaisiyat naqqad by Navedulhasan, Nazrana Bibi
(research scholars Qurtuba University, Dera Ismail khan Campaus
khaibar Pakhtoonva)
نوید الحسن، نذرانہ بی بی (پی۔ایچ ڈی سکالرز، قرطبہ یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان کیمپس۔خیبر پختونخوا

ڈاکٹر طاہر تونسوی بحیثیت نقّاد

ادب کے محتسبِ اعلیٰ مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ نقاد کئی طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے ''ڈبویا تجھ کو ہونے نے'' لیکن یہ اکیلے نہیں ڈوبتے اپنے ساتھ ادب کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ یہ نقاد دوسروں کے صبر کا امتحان لیتے ہیں۔خود کسی مشکل (از قسم مطالعہ وغیرہ) میں نہیں پڑتے۔ یہ ''بیکار مباش کچھ کیا کر'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے بقول شخصے دوسروں کی تحریروں سے تیسروں کے اقتباسات لے کر تنقیدی مقالے تیار کرتے ہیں۔ اس قسم کی تنقید کو اصطلاحاً نقد مستعار کہا جاتا ہے۔اس کے معنی ہیں ایسی تنقید جو دوسروں سے ادھار لی گئی ہو۔ ا؎

مشفق خواجہ کی ٹھوس رائے کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم کتب خانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو نوے فیصد تنقیدی کتابیں ایسی ہاتھ لگتی ہیں جو حقیقی طور پر نقدِ مستعار کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔ کھرے نقادوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے تاہم یہ بھی غنیمت ہے کہ دس فیصد سچے نقاد تو موجود ہیں۔اگر یہ بھی نہ ہوتے تو نامعلوم ادب کی رفتار و ترقی کا کیا حال ہوتا۔

عہد حاضر میں جو چند نقاد موجود ہیں ان میں ایک نام ڈاکٹر طاہر تونسوی کا بھی ہے۔ طاہر تونسوی صرف نقاد نہیں بلکہ بہت پڑھا لکھا نقاد ہے۔نقاد کے لیے صرف پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں بلکہ بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا شرط ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دوسروں کی تحریروں سے تیسروں کے اقتباسات لے کر ہی کام نکالا جا سکتا ہے۔اسکے نتیجے میں نقاد تو اپنی نظر سے گرتا ہی گرتا ہے پڑھنے والا بھی اپنے ذوق مطالعہ سے شرم سار ہوتا ہے۔ادب کی زبان میں تنقید کے معنی جانچ پرکھ کے ہیں اسی اعتبار سے نقاد کے معنی جانچنے اور پرکھنے والا ہے۔نقاد کا کام جانچ پرکھ کے بعد ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے۔اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ حال کا نقاد مستقبل کے ادب کی راہیں متعین

کرتا ہے۔طویل عرصہ گزر جانے کے بعد یونانی اور مغربی نقادوں کے متعین کردہ اصولِ نقد عصرِ حاضر کے ادیبوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ یونانی اور مغربی مفکرین نے جہاں تنقید کے اصول بتائے ہیں وہاں مشرقی مفکرین نے بھی اصولِ تنقید پر بحث کی ہے۔علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

''اس فن (تنقید) کی غرض صرف یہ ہے کہ تصانیف اور ان کے موضوع سے بحث کی جائے اور مصنف وزمانۂ تصنیف کی باہمی مناسبت ظاہر کر کے ان کتابوں سے مقابلہ کیا جائے جو کسی مخصوص موضوع پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں لکھی گئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ہر عہد اور ہر ملک کی علمی تاریخ سے نقاد کا آگاہ ہونا یقیناً لازم ہے کیونکہ فنِ نقد اور تاریخِ علم وادب میں بہت ربط پایا جاتا ہے۔'' ۲؎

نیاز فتح پوری کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے چند باتیں سامنے آتی ہیں یعنی:

۱ نقاد کا کام تصانیف اور موضوع سے بحث کرنا ہے۔

۲ تصنیف کو اس کے عہد میں رہ کر جاننا ہے۔

۳ تصنیف کا اسی موضوع پر ماضی اور حال میں لکھی گئی تصانیف سے موازنہ کرنا ہے۔

۴ نقاد کا تاریخِ علم وادب سے آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے۔

نقاد کے لیے نیاز فتح پوری کے متعین کردہ اصول نہایت جاندار ہیں۔ جب ہم طاہر تونسوی کی تنقیدات کا جائزہ لیتے ہیں تو طاہر تونسوی ان نقادوں کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے جو گنتی کے اور آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ نقاد کا اعلیٰ ترین وصف اس کا وسعتِ مطالعہ ہے مطالعے کے بغیر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ناممکن ہے۔ وہی نقاد ٹھوس رائے قائم کر سکتا ہے جو ماضی اور حال کے ادب پر گہری نظر رکھتا ہو۔ طاہر تونسوی ایک ایسا ہی نقاد ہے جسکا مطالعہ نہایت وسیع اور ادب پر اس کی نظر نہایت گہری ہے۔ طاہر تونسوی کا مطالعہ کسی مخصوص شعبے تک محدود نہیں ان کی نظر نقد اصنافِ نظم ونثر سب پر محیط ہے۔ تحقیقی اعتبار سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کا گراں قدر کام وہ مقالہ ہے جو انہوں نے ''مسعود حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامے'' کے نام سے پی ایچ ڈی کے لیے لکھا ہے۔اس تحقیقی مقالے میں بھی ڈاکٹر موصوف نے مسعود حسن رضوی کی ادبی اور نجی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو ہی بے نقاب نہیں کیا بلکہ ان کے ادبی کارناموں پر بھرپور ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر تونسوی کا زیادہ تر کام تنقید کے زمرے میں بھی آتا ہے۔''ملتان میں اُردو شاعری'' ڈاکٹر طاہر تونسوی کی معروف تصنیف ہے جس میں انہوں نے ملتان کے شعرا کی شاعرانہ کاوشوں کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح ''طنز ومزاح، تاریخ، تنقید اور انتخاب'' ان کی خوبصورت تصنیف ہے۔جس میں ڈاکٹر طاہر

تونسوی کے تنقیدی رویے نہایت نمایاں ہیں۔ ''وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر''، مشہور شاعر محسن نقوی پر لکھی گئی کتاب ہے جس میں طاہر تونسوی نے محسن نقوی کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ان کے علاوہ بھی ان کی مرتب شدہ بہت سی کتابیں ہیں جن سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقیدی بصیرت کا انداز لگایا جا سکتا ہے۔ یوں تو تاریخِ اردو ادب ڈاکٹر طاہر تونسوی کو شاعر محقق اور نقاد کے نام سے یاد رکھے گی لیکن تنقید کے میدان میں طاہر تونسوی کی اہمیت قندیل کی مانند ہوگی۔ جس سے ادب کا سفر کرنے والے روشنی پاتے رہیں گے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی میں نقاد کے جملہ اوصاف موجود ہیں وسعتِ مطالعہ، درست نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بتاریخ اردو ادب پر گہری نظر، ادبی بصیرت، خوبصورت اسلوب اور اظہار کی قوت جیسے ممتاز اوصاف انہیں ایک حقیقی نقاد کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔ اُردو ادب کے نامور محقق ،نقاد اور علامہ نیاز فتح پوری کے ادبی شاگرد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پی ایچ ڈی کے ایک تحقیقی مقالے پر اصلاح دیتے ہوئے لکھا تھا۔

''ا مبالغہ آمیز فقرے اور الفاظ نکال دیجیے۔ عبارت اور طرزِ بیان کو معتدل اور متوازن رکھیے۔

۲ تنقید و تحقیق میں قطعیت نگاری سے گریز ضروری ہے۔ کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی اس لیے تنقیدی فیصلے صادر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۳ ہر نقاد کی رائے کو الہامی سمجھ کر نقل نہ کیجیے بلکہ تائیدی یا تردیدی صورت میں اپنی رائے کا اظہار بھی ضرور کیجیے۔'' ۳؎

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقیدات کو دیکھا جائے تو ذہن و فکر میں ڈاکٹر فرمان صاحب کے تحریر کیے ہوئے جملے گردش کرنے لگتے ہیں۔ تنقیدی رائے قائم کرنے کے لیے جو راہنما اصول ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے وضع کیے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقیدات اس کی مجسم تصویر ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے بیسیوں تحقیقی مقالے اور متعدد تصانیف ہیں۔ وہ کہیں بھی ادبی مفتی بن کر فتوے صادر کرتے نظر نہیں آتے۔ ان کی رائے معتدل اور قطعیت سے پاک ہوتی ہے۔ تنقیدی فیصلے صادر کرنا ادیب کا کام نہیں۔ طاہر تونسوی کی تنقید پر کسی مذہبی نظریے یا سیاسی نقطۂ نظر کی چھاپ بھی دکھائی نہیں دیتی۔ مبالغے کی بجائے میانہ روی ان کا وصف خاص ہے۔ طاہر تونسوی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لفظوں کے استعمال میں آزاد کی طرح فضول خرچ نہیں۔ بات اور عبارت کا حجم بڑھانے کے لیے قلم کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچاتے وہ تو مختصر حملے اور تھوڑے وقت میں بہت کچھ کہہ دینے کے گر سے آگاہ ہیں۔ ان کی تنقید پیاز کی طرح نہیں کہ جہاں شروع سے آخر تک چھلکے ہی چھلکے ہوتے ہیں۔ انہیں مہارت کے ساتھ لفظوں

کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔اسی لیے بامعنی ،ٹھوس ،معنوعیت سے لبریز اور تہہ دار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اس سارے عمل سے گزرتے ہوئے وہ کبھی یہ نہیں بھولتے کہ وہ اپنی علمیت کا اظہار نہیں بلکہ ادب پارے کی قدرو قیمت کا تعین کر رہے ہیں۔ایک مثال دیکھیے مسعود حسن رضوی کے بارے میں انہوں نے یوں رائے قائم کی کہ لفظوں کا استعمال اور تنقیدی بصیرت دیدنی ہے:

''انہوں نے (مسعود حسن رضوی ادیب) اپنی ژرف نگاہی دیدہ ریزی ،محنت ،ریاضت اور ادبی دیانت داری سے اردو ادب کو وہ کچھ دیا ہے اور فردِ واحد کی حیثیت سے دیا ہے کہ بڑے بڑے ادارے بھی نہیں دے سکتے۔انہوں نے ہماری شاعری کے حوالے سے خاص طور پر غزل کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ادبی معرکوں میں اعتراضات کے جواب دیتے ہوئے لہجے کی متانت برقرار رکھی منفرد اور الگ طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان اختیار کیا۔اصولِ تنقید کے ساتھ ساتھ اصولِ تحقیق وضع کیے اور تعمیری تحقیق کا حق ادا کیا۔مضامین میں معلوماتی نکتے پیدا کیے۔لسانیاتی معلومات دِیں۔انیس کو از سرِ نو دریافت کیا اور اردو ڈرامے کے آغاز پر فیصلہ کن مہر ثبت کر دی۔ان تمام باتوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مسعود حسن رضوی کا مقام ان کے ہم عصر محققوں اور نقادوں سے کہیں بلند ہے۔اور ادبی تاریخ ان کی خدمات کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتی اور ان کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی ہر تاریخ ادھوری ہوگی۔'' ۴؎

طاہر تونسوی مفتی بننے کی کوشش نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی ادبی فتوے جاری نہیں کیے۔ادب میں دو اور دو چار نہیں ہوتے یہ کہیں تین ہوتے ہیں اور کہیں پانچ۔ادب میں ہر لمحے اور ہر جگہ اختلافِ رائے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔اسی لیے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ قطعیت نگاری سے گریز کیا جائے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقید میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔اسی لیے طاہر تونسوی کو معتدل نقاد کہا جا سکتا ہے۔ان کی تنقید مبالغے سے مبرا ،رائے جچی تلی اور تول میں پوری ہوتی ہے ،ایجاز و اختصار اور خوبصورت زبان و بیان انکے اوصافِ نقد ہیں۔راجہ محمد عبداللہ نیاز کی شاعری پر مختصر لفظوں کے ذریعے یوں تبصرہ کیا:

''راجہ عبداللہ نیاز کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حالی ،اکبر ،اقبال اور ظفر علی کی قبیل کے شاعر ہیں اور یوں ان کی شاعری قومی شاعری کے زمرے میں آتی ہے جس میں فکر کی گہرائی قومی احساس اور ملی دردنمایاں ہے۔اکبر کی طرح انہوں نے طنز و مزاح کے سانچوں سے بھی کام لیا ہے اور اس میدان میں بھی ان کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔'' ۵؎

جیسا کہ ابتداء میں یہ بات کہی گئی کہ نقاد کے لیے صرف پڑھا لکھا ہونا نہیں بلکہ بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا شرط ہے جب تک کسی نقاد کا مطالعہ وسیع نہیں ہوگا وہ اس وقت تک کسی بھی ادب پارے کے بارے میں درست رائے قائم نہیں کر سکے گا اگر چہ آج کل ایسے نقادوں کی بہتات ہے جو کسی ادب پارے کو پڑھنے کی بجائے صرف تولتے ہیں۔سرورق کی خوبصورتی اور کتابت کے حسن کو دیکھ کر ناقدانہ فیصلے صادر کرتے ہیں۔طاہر تونسوی اس قسم کی تنقید کے قائل نہیں۔ان کی تصنیفات وتالیفات کی فہرست خود ان کی عمر سے کہیں زیادہ ہے۔انہیں پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ صرف پڑھنے اور لکھنے کا ہی کام کرتے ہیں۔ان کے قلم سے نکلے ہوئے جملے نہ صرف مستند ہوتے ہیں بلکہ مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح بولتے ہوئے بھی۔جس ادیب وشاعر کے بارے میں طاہر تونسوی رائے دیتے ہیں وہ نہایت حقیقت پسندانہ اور معیاری ہوتی ہے اسی حقیقت پسندی کی وجہ سے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔کشفی ملتانی اور عاصی کرنالی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے کتنی بھرپور ہے ان کی تنقیدی نظر،لفظوں کا انتخاب اور راختصار کی خوبی دیکھنے کے قابل ہے۔کشفی ملتانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کشفی ملتانی فنِ اردو شاعری کی آبرو ہے۔اسکی شاعری کا لینڈ سکیپ بہت وسیع ہے جہاں ان کے تجربات،مشاہدات،کیفیات،حادثات،روایات اور قلبی واردات کے بھرپور رچاؤ کا عکس دکھائی دیتا ہے وہاں کشفی کی شاعری ایک ایسے جنگل کی طرح ہے جہاں رنگ برنگے پھول بھی ہیں۔نئی نویلی کلیاں بھی ہیں اور خاردار جھاڑیاں بھی۔جہاں ایک طرف دکھوں کا خزاں زدہ چمن ہے وہاں مسرتوں کی بہار کا جوبن بھی۔'' ۶ ص

عاصی کرنالی کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ ہو:

''عاصی کرنالی کی شاعری میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے مگر انہوں نے اس رنگ کو فنِ شاعری پر غالب نہیں آنے دیا۔وہ فن کے بارے میں چار باتوں کو ضروری خیال کرتے ہیں۔خلوص،ریاضت، مسلسل مطالعہ اور صحبتِ اہلِ کمال ان کے مطابق ان چار ستونوں سے جو عمارت بنے گی وہ یقینی طور پر مضبوط ہوگی۔نظم میں اخلاقی اقدار کی بلندی انسان دوستی اور حب الوطنی کے مضامین ملتے ہیں۔'' ۷

بہترین نقاد کے لیے مختلف اساتذۂ ادب نے جن اوصاف کو ضروری گردانا ہے ان میں ایک وصف تاریخِ ادب سے آگاہی ہے۔اگر کوئی نقاد ماضی کے ادب سے بیگانہ اور اپنے عہد کے ادب سے لاتعلق ہے تو وہ کسی بھی ادب پارے پر مثبت رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔کسی بھی ادب

پارے یا ادیب و شاعر کو صرف اس کی ذات میں رہ کر پرکھا نہیں جا سکتا کسی بھی شاہ پارے پر تنقیدی حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق ماضی اور حال میں کیا کچھ لکھا گیا ہے اس معاملے میں طاہر تونسوی بہت محتاط ہیں۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں وہ اس کی تاریخ سے مکمل طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ موازنے کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتے۔ کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے وہ ماضی کا سفر کرتے ہوئے حال میں داخل ہوتے ہیں۔ اور یوں تصنیف کی ادبی قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ معروف شاعر محسن نقوی کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''میرے سامنے اقبال ہیں فیض ہیں ندیم ہیں عرش صدیقی ہیں پھر محسن نقوی ہیں جن کا فن اردو شاعری کا بہت بڑا حوالہ ہے۔ الگ لب ولہجہ کے باوجود اور الگ الگ شناختی کارڈ رکھنے کے باوجود ان کی شاہراہ ایک ہے یعنی محبت کے عظیم جذبے کی شاہراہ جس سے کئی شاہراہیں اور کئی راستے نکلتے ہیں۔ اقبالؔ کے فکر و فلسفہ کی اساس عشق ہے۔ فیضؔ کا پیغام محبت ہے ندیمؔ کی شاعری انسان سے محبت کا منظر نامہ ہے۔ عرش صدیقی کے ہاں ارفع ترین محبت اعلیٰ ترین تصور ''محبت لفظ تھا میرا'' کے حوالے سے موجود ہے۔ محسن نقوی کا بھی یہی منشور ہے کہ ؎

مجھے کسی سے محبت نہیں کسی کے سوا میں ہر کسی سے محبت کروں کسی کے لیے '' ۸؎

ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کوئی مقالہ اور تنقیدی کتاب دیکھی جائے وہ ہر جگہ مختلف ادوار کے مطالعے سے گزرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ کسی بھی نقاد کی یہ خوبی معمولی نہیں ہے کہ وہ کسی بھی ادب پارے کو صرف اس کی ذات میں رہ کر نہیں بلکہ تاریخ کے حوالے سے جانچتا اور پرکھتا ہے۔ یوں طاہر تونسوی بھی اردو ادب کا غیر معمولی نقاد بن کر ابھرا ہے۔ بعض اساتذۂ تنقید کا یہ خیال ہے کہ تنقید کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے۔ اس کے لفظوں میں لطافت و شگفتگی کی بجائے سنجیدگی اور فلسفیانہ کیفیت ہوتی ہے۔ طاہر تونسوی کی تنقید پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہترین تنقید میں تخلیقی جوہر بھی موجود ہوتا ہے۔ طاہر تونسوی کا اسلوب نہایت خوبصورت اور رواں دواں ہے وہ سچی بات کہتے ہیں مگر کڑوے انداز میں نہیں میٹھے اور لطیف انداز میں! ایک مثال دیکھتے ہیں:

''محسن نقوی نے ''ردائے خواب'' میں اپنے عشق موسموں اور محبت کی جلتی ہوئی ابدی رتوں کے منظر میں غموں کی جو بارش نازل کی ہے اس کا زمینِ دل پر خریف و ربیع کی ادبی فیصلوں کے لحاظ سے اتنا خوشگوار اثر پڑا ہے کہ سونا یوریا کی ضرورت نہیں رہی۔'' ۹؎

ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

''محسن نقوی کو اپنے عہد کے مسائل کا گہرا احساس ہے وہ زندگی کی تباہ کن باؤلنگ ۔ سے نہ تو خوفزدہ ہیں اور نہ ہی وہ اپنی وکٹیں چھوڑ دیتا ہے بلکہ بڑی مضبوطی سے بلا ہاتھ میں لے کر زندگی کی گیند کو اتنے زور سے ہٹ کرتا ہے کہ اس کا عہد اسے داد دینے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ نہ تو کسی سطح پر سمجھوتا کرتا ہے اور نہ ہی کبھی ایسے خیال اپنے قریب پھٹکنے دیتا ہے۔'' ۱۰؎

اصنافِ نظم ونثر میں شاہد ہی کوئی صنف ایسی ہو جو ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ہاں بار نہ پا سکی ہو'' تذکرہ کتابوں کا'' ان کی ایسی کتاب ہے جس میں شاعری ،فکشن ،تنقید، سفر نامہ، خاکہ نگاری ،طنز و مزاح، غالبیات اور اقبالیات پر لکھی گئی کتابوں پر تنقید وتبصرہ ہے یہ اگرچہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن طاہر تونسوی کی تنقیدی بصیرت کو سمجھنے میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ طاہر تونسوی اردو ادب کا بلند ذوق رکھتے ہیں۔ تنقید کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں اس اعتبار سے کسی بھی ادب پارے کی خوبیوں اور کمزوریوں کو بے لاگ انداز میں بیان کیا جانا چاہیے ۔ڈاکٹر طاہر تونسوی فطرتاً ادب دوست اور انسان دوست آدمی ہیں۔ ان کی ادب دوستی اور انسان دوستی کی جھلک ان کی تنقیدات میں بھی ملتی ہے۔ یہ اس طرح کہ طاہر تونسوی کی تنقید میں حسن کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ وہ جس ادب پارے پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اس کے روشن پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ کمزوریوں اور کوتاہیوں پر عموماً ان کی نظر نہیں ٹکتی۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر طاہر تونسوی حالی کے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ حالی بھی داد وتحسین دینے کے سلسلے میں نہایت فراخ دِل تھے اور طاہر تونسوی بھی کسی بھی ادیب وشاعر کو کھلے دل سے شاباش دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے ان کے اس رویے کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں کو کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے یوں تو ان کی ساری تصانیف اور مقالے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں دو مثالیں پیش ہیں۔ حمیدہ چغتائی کا ناول ''دولت کے رشتے'' شائع ہوا تو طاہر تونسوی نے اس پر لکھا:

''انہوں نے پورے ناول پر اپنی گرفت قائم رکھی ہے اور موضوع وکہانی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے انہوں نے سماجی و معاشرتی تضادات دولت پر انسانی رشتوں کو قربان کر دینے کے رویے ۔ دوسروں کے جذبات کچل کر اپنی خواہشات پورا کرنے کی ضدیں، محبتیں، نفرتیں، قربانیاں اور اسی قبیل کے دوسرے احساسات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ۱۱؎

کرنل نازسرحدی کا شعری مجموعہ ''دریچہء دل'' شائع ہونے پر طاہر تونسوی نے یوں تبصرہ کیا:

''نازسرحدی نے بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ عشق ومحبت کے زاویوں کے تمام تر خدوخال کو منظوم

کیا ہے۔ رنگ کے جادو سے مصور کیا ہے۔ نور کی سوچوں سے منور کیا ہے۔ نرم و لطیف صباؤں سے شعری فضاؤں کو معطر کیا ہے۔ غم دوراں کو اجاگر کیا ہے اور اس طرح دلوں کو مسخر کیا ہے۔'' ۱۲؎

انہی اوصاف کی بناء پر طاہر تونسوی کو سخت گیر نقاد کی بجائے نرم خو نقاد کہنا زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے۔

مآخذ

۱۔ خامہ بگوش کے قلم سے مرتبہ مظفر علی سید کالم ''نقدِ مستعار''، لاہور: پاکستان رائٹرز کوا پریٹو سوسائٹی شاہراہِ قائداعظم، ص ۱۳۸

۲۔ نگارِ پاکستان سالنامہ ۱۹۸۸ اصنافِ ادب نمبر، ادبیات اور اصول نقد از نیاز فتح پوری، ص ۱۴۹

۳۔ اردو صحافت میں طنز و مزاح کا ارتقاء مقالہ برائے پی ایچ ڈی مسودہ مملوکہ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری

۴۔ طاہر تونسوی' ڈاکٹر، مسعود حسن رضوی ادیب، حیات اور کارنامے، لاہور: مجلسِ ترقی ادب کلب روڈ، ص ۳۳۰

۵۔ ملتان میں اردو شاعری از ڈاکٹر طاہر تونسوی، راجہ محمد عبداللہ نیاز، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۴۸ء، ص ۵۳

۶۔ ملتان میں اردو شاعری از ڈاکٹر طاہر تونسوی، کشفی ملتانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۴۸ء، ص ۶۲

۷۔ ملتان میں اردو شاعری از ڈاکٹر طاہر تونسوی، عاصی کرنالی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۴۸ء، ص ۱۵۰

۸۔ وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر از طاہر تونسوی، ملتان: سطور پبلی کیشنز گلگشت کالونی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۷

۹۔ وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر از طاہر تونسوی، ملتان: سطور پبلی کیشنز گلگشت کالونی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۹

۱۰۔ وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر از طاہر تونسوی، ملتان: سطور پبلی کیشنز گلگشت کالونی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۶

۱۱۔ تذکرہ کتابوں کا از ڈاکٹر طاہر تونسوی، سماجی اور معاشرتی شعور کا ناول ترجمان ناول، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۳

۱۲۔ تذکرہ کتابوں کا از ڈاکٹر طاہر تونسوی، سماجی اور معاشرتی شعور کا ناول ترجمان ناول، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۶ء، ص ۸۳

☆☆☆

غزلیں Ghazlein

Aslam Imadi (Hyedrabad)
cell-9966683014
اسلم عمادی (حیدرآباد)

مزاج و فکر میں ہم نے مشابہت دیکھی
کہ رہنما و عدو میں مماثلت دیکھی

جو کر رہا تھا وفا کی دفاع منبر پر
اسی کے فعل میں پنہاں منافت دیکھی

چراغ فکر سمجھتا رہا سفینہ جسے
تو اس کی لو میں بھی پوشیدہ مصلحت دیکھی

محاصرہ میں ہیں آنکھیں ،زبان،صوت و صدا
عجیب طرح کی ہر سو مخاصمت دیکھی

وہی پرانہ طریقہ وہی ہے شیو ء جنگ
کہ وحشیوں کی طرح یاں مبازرت دیکھی

ہرایک رشتہ بنا آلہ ء تجارت اب
منافعت کے لئے ہر مصالحت دیکھی

ہر ایک سطح پہ پوشیدہ ہیں دبیز تہیں
تحفظات یہاں پر پرت پرت دیکھی

تری نگاہ بدلتی گئی شناخت کے رنگ
ہرایک رنگ میں پر ہم نے غیریت دیکھی

وہ صدرِ بزم ہے اسلمؔ تو ردو کد کیسی
خموش رہنے میں ہم نے بھی عافیت دیکھی

☆☆☆

(2)

نہ جانے کیا ہوا قابو میں اب مزاج نہیں
مری اداسی کا یوں بھی کوئی علاج نہیں

عجب یہ ہے کہ کیا میں نے اعتبار ترا
یہاں وفا کا سراسر کوئی رواج نہیں

سوائے دید نہیں کوئی آرزو میری
سوائے عشق مرا کوئی کام کاج نہیں

دیار فکر کے حالات ہیں دیگر گوں اب
یہہ خطہ وہ ہے کہ جس پر کسی کا راج نہیں

بہت سے رنگ ہوئے غرق اس سیاہی میں
کہ روشنی کا اندھیرے سے امتزاج نہیں

یہ سوچتا ہوں جو دل میں ہے اس سے کہہ ڈالوں
پہ وسوسا یہ سکھاتا ہے،چھوڑو آج نہیں

مروتاً وہ ملا ہوگا مجھ سے بھی اسلمؔ
یہ اتفاق کوئی وجہ ابتہاج نہیں

☆☆☆

Khalid Jamaal (Varanasi)
cell-9838202248
خالد جمال (وارانسی)

حشر کہیں برپا ہوگا
گھر میں سناٹا ہوگا

دریا جب اترا ہوگا
تم نے بھی دیکھا ہوگا

کس نے کب سوچا ہوگا
پھولوں سنگ بھنورا ہوگا

اپنے رب کو سجدہ کر
اس سے بہتر کیا ہوگا

اتنا دل پر کیا لینا
جو ہوگا اچھا ہوگا

لوگ یہاں گوونگے بہرے
چلانے سے کیا ہوگا

کھل کے جب بارش ہوگی
منظر تب اجلا ہوگا

لوگ گھروں میں بند ہوئے
تنہا ہر رستہ ہوگا

چپ سادھے بیٹھا ہے وہ
پھر کوئی فتنہ ہوگا

اس پہ کیا بیتی ہوگی
ڈار سے جب بچھڑا ہوگا

قطرے کو کیوں روتے ہو
قطرہ ہی دریا ہوگا

پتھر ہو جایں گے دکھ
اب کھل کر رونا ہوگا

(2)

اے مرے یار ! ایک بار کرو
برف جذبوں کو آبشار کرو

اس کے وعدے کا اعتبار کرو
لوٹ آئے گا انتظار کرو

جانے والوں کو یوں نہ روءو تم
اپنی باری کا انتظار کرو

سر میں سودا اگر سمایا ہے
ریگزاروں کو لالہ زار کرو

عزت نفس تو ضروری ہے
وضع داری بھی اختیار کرو

وقت رکتا نہیں کسی کے لئے
جو بھی کرنا ہے میرے یار کرو

ان چراغوں کو اب بجھا دو تم
شب کا دامن نہ تار تار کرو

اتنی ناراضگی نہیں اچھی
اس سے رشتے کو استوار کرو

بادباں کھولنا مگر پہلے
ان ہواؤں کو سازگار کرو

یہی انصاف کا تقاضا ہے
آج تم خود کو سنگسار کرو

ذکر آئے تو لوگ ہنسنے لگیں
یوں نہ تم خود کو بے وقار کرو

(3)

راز رکھیں کہ رازدار رکھیں
کب تلک خود کو بے وقار رکھیں

اپنا ماحول خوشگوار رکھیں
درمیاں کچھ تو انکسار رکھیں

ان ہواؤں کے خوف سے کب تک
ہم چراغوں کو سوگوار رکھیں

جانے کب کون راہ رو آئے
اپنی شاخوں کو سایہ دار رکھیں

ماہ شب تاب کے ابھرنے تک
شب کے دامن میں انتظار رکھیں

رابطہ گر چہ ٹوٹ بھی جائے
اپنے رشتے پہ اعتبار رکھیں

ریت دامن نچوڑ ہی دے گی
پیاس پر اپنی اعتبار رکھیں

☆☆☆

Sohail Iqbal (Riyadh,KSA)
cell-00966554711667
سہیل اقبال (ریاض،سعودی عرب)

بانہوں کا اک حصار تھا ،جو اب نہیں رہا
اک رشتہ پائدار تھا جو اب نہیں رہا

جن کو ہمیشہ اگلی صفوں میں جگہ ملی
ان میں مرا شمار تھا، جو اب نہیں رہا

نغمہ کسی کی یاد کا بجتا تھا رات دن
اس دل میں اک ستار تھا جو اب نہیں رہا

شعلوں کا کاروبار ہی کرنا پڑے گا اب
پھولوں کا کاروبار تھا ،جہ اب نہیں رہیا

زخموں کو اپنے دیکھ کے کہنا پڑا مجھے
اپنوں پہ اعتبار تھا ، جو اب نہیں رہا

ہر روز اس میں بیٹھ کے لگتا تھا اپنا دل
اجڑا ہوا دیار تھا، جہ اب نہیں رہا

☆☆☆

(2)

وہ کب کسی کا کہاں احترام کرتا ہے
مجھے کچھ اور سمجھ کر سلام کرتا ہے

اسی کی بات پر ہم اعتبار کرتے ہیں
شراب پی کے جو اکثر کلام کرتا ہے

ہمیشہ گھر سے نکلتا ہے بے سرو ساماں
سفع سے پہلے بڑے اہتمام کرتا ہے

ہر ایک شخص بناتا ہے گھر مگر اس کو
اکیلے پن یا اداسی کے نام کرتا ہے

تھکن بھی اپنی ہمیشہ اتارتا ہے وہی
سفر کا اپنے جہاں اختتام کرتا ہے

بنا کے بیت۔خشب بیچتا ہے دنیا میں
شجر کے سائے میں اکثر قیام کرتا ہے

وہ اب تو آنے سے ڈرنے لگا ہے شہروں میں
بہت دنوں سے جو جنگل میں کام کرتا ہے

عجیب شخص ہے جس کو سہیلؔ کہتے ہیں
ہر ایک لمحہ محبت کے نام کرتا ہے

Gojari Adab گوجری ادب

Mian Nizamuddin Larvi te Jadid Gojri Zaban o Adab by Prof. Dr. Rafique Anjum(Chair Professor, Tribal Studies-BGSBU, Rajouri)
پروفیسر ڈاکٹر رفیق انجم (راجوری)

حضرت میاں نظام الدین لاروی تے جدید گوجری زبان وادب

تاریخ گواہ ہے جے دنیا ماء ہمیشاں اُسے زبان نے ترقی کی ہے جس نا سرکاری پشت پناہی نصیب ہوئی۔ گویا وقت کا بادشاہ کی زبان ہی سرکاری زبان کا درجہ تک پہنچتی رہی۔ گوجری زبان کا شاندار ماضی کے پچھے بھی یوہ ہی راز تھو۔ صدیاں تک قائم رہن الی گجر حکومتاں کی وجہ تیں یاہ زبان عوام کی عام فہم زبان بھی بنی تے اس ماتحریر تے اشاعت کو سلسلو بھی قائم ہو یو، تے فر سیاسی زوال کے نال ہی زبان نا وی زوال اگیو جس تیں اج توڑی وی گوجری زبان پوری طرح نئیں سمھل سکی۔ پر بیہویں صدی کا شروع ماجموں کشمیر ما گوجری کا دو جا جنم کے پچھے بھی اک بادشاہ کو ہتھ تھو جس نے اپنی مادری زبان، اپنا دربار کی سرکاری زبان بنا کے رکھی۔ اک ایسو بادشاہ جس نے زمین کا بے جان ٹوٹاں پر نہیں بلکہ ہزاراں لکھاں دِلاں ور حکومت کی۔ اس شہنشاہ تے اس ہمدرد نا دنیا بابا جی صاحب لاروی؟ کا ناں سنگ جانے۔

حضرت میاں عبیداللہ لاروی المعروف بابا جی صاحب لاروی اج توں تقریباً ڈیڈھ سو سال پہلاں 1864 ما ضلع ہزارہ کی بالاکوٹ تحصیل کا سنجوڑہ گراں کا اک بجران خاندان ما پیدا ہو یا۔ ولادت تیں پہلاں ہی کسے بزرگ نے والدین نا بشارت دتی تھی جے تھاری نسل ما اک بڑا روحانی مقام کو شخص پیدا ہوے گو۔ بابا جی صاحب چار سال کی عمر ما ہی یتیم ہو گیا تے بچپن کا دس پندرہ سال انتہائی غریبی ما گزریا۔ ویہہ اپنا پنجابی کلام ما اپ فرماویں:

حال یتیماں رب نہ دسے جد مصیبت اوے — جھڑکاں دیون لوک تمامی تن من سب جل جاوے
وقت غریبی یار نہ کوئی نہ کوئی ساک قبیلے — وچ گلیاں دے پھرن نمانے سر ننگے رنگ پیلے

بچپن تیں ہی حضرت کو دھیان عبادت الے پاسے تھو۔ ویہہ کنیاں شریف کا اک روحانی بزرگ حضرت نظام الدین کیا نوی تیں بیعت ہو یا تے عبادت تے چلّہ کو سلسو شروع کیو۔ اپنا مرشد کا حکم نال ویہہ کشمیر ایا تے فر اِتے ہی وانگت لار ما مقیم ہو گیا۔ اخر اِتے ہی تریٹھ سال کی عمر ما 1926 ما وصال ہو یو۔ کامل مواحد تے شریعت کی پابند اس شخصیت نے پوری زندگی ما اپنا ملن الاں ناہدایت کو رستو وی دسیو تے اُن کے دربار شعر وادب تے تصوف کی جہڑی محفل ہوتی رہئیں ویہی اصل ما جدید گوجری ادب کی بنیاد بنیں۔ گوجری کا پہلا دور کا تقریباً سارا ادیب تے شاعر روحانیت تے شعر وادب کا اس غیر سرکاری ادارہ یعنی لاروی دربار تیں فیضیاب ہو یا تے یوہ فیض اجھاں وی جاری ہے حضرت بابا جی صاحب اپ بھی پہاڑی پنجابی کا بڑا شاعر تھا۔ ان کی تصنیف "اسرار کبیری" تے "ملفوظات نظامیہ" سی حرفی کی شکل ما ہیں۔ جن ما مذہبی معاملات، تصوف کی باریکی، سوانح حیات تے درود تے وظیفہ شامل ہیں۔ پنجابی کلام کا نمونا: ت:

تار سکی اوہناں ماہلیاں دی، ویکھو ماہلیاں تے بُوٹی لال ہوئی ہے
پھُل کھلیا بگونمانیاں دا، ویکھو بھادرے دی کیسی چال ہوئی ہے
اسونکلدے کتک دے جوڑ اندر، دھپ گھٹ تے ٹھنڈ کمال ہوئی ہے
عبدا گذری عمر تمام میری، روح بت دی اک مثال ہوئی ہے
لمی رات سجودتے وچ رہئیے بہتا مُل پیسی چشماں ساڑیاں دا
کلمہ نفی اثبات عبدا سنگ تیرے شفاء ہے جہڑا مرضاں ساریاں دا

اُن کی زندگی تے تعلیمات پر کئی موٹی موٹی کتاب لکھی جا سکیں۔ لیکن اِت انھاں کو مختصر ذکر گوجری زبان تے ادب کا حوالہ سنگ ہے جس ما اُن کی غیر سرکاری تے بے لوث خدمات کو اعتراف نہ کرنو میرے نزدیک کفر کے برابر ہے۔ اس غیر سرکاری، روحانی تے ادبی ادارہ توں جہڑی پہلی جماعت تیار ہوئی اُس ما سائیں قادر بخش، میاں فتح محمد درہالوی،، حضرت بابا نظام الدین لاروی، حاجی اسرائیل کھٹانہ، چودھری دیوان علی کھٹانہ، مولانا مہر الدین قمر، چودھری غلام حسین لسانوی، خدا بخش زار، مہجور تے ذبیح راجوروی، شمس الدین مہجور، محمد اسرائیل اثر تے عبدالکریم پرواز جیہا ناں انویں۔ ان تمام باصلاحیت بزرگاں نے اپنا ہمعصر حضرات نال مِل کے جن سیاسی، سماجی، تے ادبی خدمات کو بیڑو چایو اُن ماء※ متفقہ طور پر حضرت بابا نظام الدین امیر القوم تھا تے انھاں نے یہ سب ذمہ داریں جس خوش اسلوبی نال نبھائیں، اُس کی مثال لوڑیاں نہیں لبھتی۔

حضرت بابا نظام الدین لاروی ہور، بابا جی صاحب لاروی کا فرزند تے جانشین تھا۔اُن کی پیدائش 25 مارچ، 1896 ماواتگت بابا نگری ماء ہوئی تے اتے ہی 10 اکتوبر 1972 ما انھاں کی وفات ہوئی۔سلسلہ نقشبندیہ کا روحانی بزرگ ہون کے نال سیاست تے ادب ما بھی اُنھاں کو اُچّ اُچو مقام ہے۔گجر قوم نا بے بسی کی حالت توں ترقی دے کے عزت دار قوماں کی صف ما شامل کرن ما حضرت جناب بابا نظام الدین لاروی ہوراں کی دوراندیشی تے عملی کوشش شامل تھی۔انھاں نے سماجی نابرابریاں کے خلاف جنگ ما چودھری غلام حسین لسانوی مرحوم، چودھری دیوان علی مرحوم، مولانا مہر الدین قمر، حاجی محمد اسرائیل کھٹانہ تے چودھری محمد عبداللہ جیہا قوم کو درد رکھن الاں کا اسرار پر جس گُجر جاٹ کانفرنس کی بنیاد رکھی تے اُس کی قیادت قبول کی تھی اُس گوریاستی گُجراں کی تاریخ ما بڑو اہم رول رہیو ہے۔ویہہ اپ وی مُلک کی تقسیم تیں بعد قریب دس سال توڑی ریاستی قانون ساز اسمبلی کا ممبر وی رہیا تے نُوں علم کے نال نال انھاں نے مدت توڑی قوم کی سیاسی ذمہ داری بھی نبھائی تے خوب نبھائی۔لاروی دربار کا جانشین ہون کے ناطے انھاں نے سلسلہ نقشبندیہ کو روحانی سلسلو بھی جاری رکھیو تے ہور اگے بدھایو۔ہزاراں لوک اُنھاں تیں بیعت ہو یا۔لیکن انھاں نے جس کمال نال شریعت تے طریقت کو توازن رکھیو وہ ہر کسے نا نصیب نہیں ہوتو۔اپنا دور کا عالم لوکاں سنگ وی ان کا تعلقات اتنا ہی ڈُونگا تے مضبوط تھا جتنا روحانی بزرگاں نال۔

اس طرح اسمبلی مانھ نمائندگی، لوکاں کا اپسی معاملاں کا فیصلہ، دین کی خدمت، روحانی رہنمائی تے ادبی دلچسپی سب کُجھ چنگی طرح نبھایو۔قریب توں جانن الاں کو کہنو ہے جے اُن کی مجلساں ما دینی مسائل، معیاری محفل، شعروادب کا تذکرا تے عشقِ حقیقی کیں لذت امیز گفتگو ہوتی رہیں تھیں۔سوہنا شعر نال انھاں نا پیار تھو تے اپ وی نہایت ہی خوبصورت شعر کہیں تھا۔ذرا سی حرفی کو اک بند دیکھو:

ذ: ذکر تیرو میرا دل اندر ایسوں تیرو نہ یار خیال اِنگا
قسم رب کی ہوئی تباہ ڈھولا تیناں واسطو دیکھ احال اِنگا
جیکر اُنگا جا کے ہونو خوش چنگو تاں بھی چھوڑ نہ دلوں خیال اِنگا
اُنگا من نہ من نظام مرضی سنتو جا کن دھر خیال اِنگا

پہلا دور کا اکثر گوجری لکھاڑیاں ہاروں میاں نظام الدین لاروی ہوراں کو وی زیادہ کلام پنجابی سی حرفی کی صورت ما ہی ہے جہڑو ''اشعار نظامی'' کا ناں سنگ شائع ہو یو ہے۔گوجری مانھ اُنھاں نے تھوڑو لکھیو ہے پر معیاری تے مثالی لکھیو ہے۔اُن گا کلام مانھ روحانی کیفیات تے تصوف

کا پہلُو نمایاں ہیں۔ زِندگی مانھ اکثر روئیں ہوئیں تھا تے رون نا فخریہ طور پر اپنی وراثت سمجھیں تھا۔ اُنکا دربار مانھ اکثر ادبی محفل لگیں ہوئیں تھیں جِن مانھ سائیں قادر بخش، خدا بخش زار، مولانا اسماعیل ذبیح، مولانا مہرالدین قمر، اسرائیل اثر تے اقبال عظیم جیہا ناں قابلِ ذِکر ہیں۔ بلکہ کُجھ شعراں پر سائیں قادر بخش ہوراں کولوں اصلاح لین کا وی ثبوت لبھیں۔ جِس توں اُن کی علم کی قدردانی کو اندازو لایو جا سکے۔ انھاں نے بے شمار سی حرفی، کافی، غزل، نعت تے منظوم خط لکھیا۔ ہوں ذاتی طور اقبال عظیم ہوراں کا اس بیان نال متفق ہاں کہ بابا صاحب کو کلام فنی لحاظ نال مکمل، تاثیر کا لحاظ نال بے بدل تے زبان کا لحاظ نال عام فہم ہے۔ گوجری ما خود مختصر مگر معیاری شاعری باقی شاعری پر بھاری سئ لگے۔ اپنا روحانی سلسلہ کی تعلیم کے مطابق اپنی نجی زندگی ما بھی بابا صاحب بہت روئیں تھا تے اتھرواں نال بہت پیار تھو۔ قمر راجوروی مرحوم لکھیں کہ اک بار میں پچھیو کہ حضرت تَم اتنا زیادہ کیوں روئیں؟ فرمان لگا" جھلیا رونو مھاری وراثت ہے۔ خدا بخش زار نا اُن کی مجلس کی تاثیر نال اکثر رون کی عادت تھی تے اُن پر خوش ہو کے بابا صاحب ہوراں نے اُن کو تخلص زار رکھیو۔ اس حقیقت نا سمجھن واسطے انھاں گو سدا بہار کلام نمونہ کے طور پیش ہے:

اتھرواں نا پچھے کوئے ....

اتھرواں نا پُچھے کوئے دسو کِتوں اویں تم — کڈھ کے رت کلیجہ بچوں پانی کیوں بناویں تم
موتی دُرِ مکنون ہیں اصلی، کوڈی مُل بکاویں تم — روئیں اپ شریکاں اگے اینویں جگ ہساویں تم
جھولی نا تم الا بھولا، تر کریں کِس کاری — جان سُکاویں کپڑا ابھجیں، مُجرے کھڑے اویں تم
وزن تھارو نہیں گھٹ سمندروں، گھٹ کیوں اپ بناویں تم — جا گُجانہ ڈوہلو موتی، اپنو مُل گھٹاویں تم
ندی وی سُک جائیں اخر، تم فِر کیوں نہیں سُکتا — کِت نظام ہے چشمُو تھارو، کِتوں اویں جاویں تم

اتھرواں نا پُچھے کوئے ...

میرو ایمان ہے جے زندگی تے ادب ماء جھڑ واتھروں کو مقام ہے وہ ہاساں نا نصیب نہیں ہوتو۔ ہاساں کو شاید وقتی مُل تے ہو سکے مگر ہاساں کو وزن نہیں ہوتو۔ بقول اسرائیل اثر:

غم کی بولیں مِٹھیں مِٹھیں اس کا شعر سلونا، — بے درداں کی گل بھی لکھیں سخن کلام سلونا

ادب یا شاعری کا دو بنیادی نظریا گوجری زبان پر بھی صحیح ثابت ہوئیں۔ بقول اختر الایمان 'انسان شاعری کرتو نہیں شاعری ماحول کے اندر پہلاں توں موجود ہوے تے شاعر فقط اس ما شامل ہو جائے۔ اس گل نا کدے معیار من لیاں تاں لکھاڑی حضرات میری اس گل نال متفق ہوئیں گا

کہ بابا نگری کا ادبی ماحول ما جو تخلیق کار گیو کدے سخنو نہیں مُڑ یو۔ گویا اُن پارس مجلساں ماہزاراں پتھر گیٹا دنیا نے ہیراتے موتی بنتا ڈِٹھا ہیں۔ جِت مذہب فرقہ تے زبان کی قید نہیں تھی۔

جت توڑی گوجری لکھن الاں کو تعلق ہے گوجری کا سرکردہ لکھاڑیاں ما شاید ہی کوئے ایسو ناں ہوے، جہڑ و ادب کا سلسلہ ماء اس دربارتوں فیضیاب نہ ہو یو ہوئے۔ کئیاں مالیاں کا لگا وابوٹا جھونس جائیں یا پھلتاں ہی روڑ تے ڈوڈیں سُک جائیں پر اس گلشن کا بوٹا جت جت لگا دھیاڑاتوں دھیاڑا گھونپھرا ہی ہوتا گیا۔ اس دربار نال تعلق رکھن الا عام شاعراں تے ادیباں تیں علاوہ گوجری صحافت کا نُن کن سروری کسانہ مرحوم ہویں یا گوجری ادب کا پیر پنجال حاجی رانا فضل حسین راجوروی یا فر گوجرا لکھاڑیاں ما سب توں زیادہ پڑھی لکھی تے بین الاقوامی شخصیت ڈاکٹر صابر افاقی ہور، ؛ گوجری کا عظیم محسن اقبال عظیم ہور ہویں، تاریخ دان کے ڈی بینی یا موجودہ دور گا قبائلی سکالر ڈاکٹر جاوید راہی، ان سب نے بابا صاحب کی عظمت تے لاروی دربار کی ادبی خدمات کو اعتراف کیو ہے۔ لہٰذا امیر القوم کی طرح جدید گوجری کا محسن، محافظ تے بابائے گوجری ہون گو سہرو وی انھاں ہی گے سِر سو بھے! بے شک گوجری کا اس لاروی دبستان کو فیض جتنی دیر تک تے جتنو دور تک پوہچیو ہے، اس کی دو جی مثال کسے نا نئیں سرتی۔

اک دوجا فلسفہ کے مطابق ذہانت تے فنی صلاحیت پہلاں توں ہی کسے انسان کے اندر موجود ہوئے۔ اگر اس نا معیار من لیاں تاں اس حقیقت کو بھی اعتراف کرنو پوئے گو کہ بابا صاحب کی مجلساں نے جس جس نا ادب کی راہ دسی اُس نے کدے خطا نئیں کھا ہدی۔ مثلاً گوجری کا بہترین شاعر خدا بخش زار صاحب نا بابا صاحب ہور اک مجلس ما پنجابی شعر سُن کے اتنی گل کہیں جے 'خدا بخش توں گوجرا شعر نئیں کہتو تے اُس توں بعد زار صاحب کا گوجرا قلم کی روانی کوئے نہ روک سکیو۔ اس طرح زار کے اندر جہڑی شاعری موجود تھی اس نا چکان لشکان الی حضرت بابا نظام الدین لاروی ہوراں کی بابرکت ذات تھی۔ زار صاحب برائے نام دو جماعت پڑھیا وا تھا پر شاعری واسطے ڈگریاں توں زیادہ طبعیت کا میلان کی ضرورت ہوے جہڑ و زار صاحب ما اُتم موجود تھو۔ پر اتنی معمولی تعلیم کے نال شعراں ما اس قدر فنی پکیئت، اتنی خوبصورتی تے اس قدر خالص ادبی محاوراں کو موجود ہونو ہمناں اس گل پر مجبور کرے جے ہم ان کی شاعری ما بابا صاحب کی تربیت تے ان کی مجلساں کی تاثیر کو اعتراف کرلیاں۔ زار صاحب کی شاعری کو ایک بند دیکھو:

ج: جر جر کے صبر کر کرکے بولی مرمر کے کت ہے ترس تیرو

کدے ہس کے گل وی کائے کی ہے، ڈرتا رہیا کہتا ہر کم سرس تیرو
دھر دھر ہانڈیاں ماتڑ کاتیں لایا، لیوناں نئیں کدے بے ترس تیرو
نہیں خواب مازارنا منہ دسیو، ہُن یوہ گذر گیو تیجو برس تیرو

دربار لا روی روحانیت تے ادب کو وہ غیر سرکاری ادارو رہیو ہے جس توں مذہب، ذات تے نسل کی تفریق توں بغیر لوکاں نے فیض حاصل کیو۔ ان مجلساں کی تاثیر و یہی لوک سمجھ سکیں جنہوں نا ان مجلساں ما شامل ہونو نصیب ہو یو۔ مھارے کول اسرائیل اثر تے اقبال عظیم جیہا معتبر لکھاڑی ان مجلساں کا چشم دید گواہ ہیں جنہاں نے سائیں قادر بخش تے زار صاحب جیہاں نال بیس کے سانجھی شاعری کی تے اس مقصد کو سلسلوا گے بدھایو۔ اس ادارہ کی تے ان مجلساں کی قدر ذبیح؟ تے مہجور؟ صاحب توں کوئے پچھیو، قمر راجوروی تے رانا فضل حسین توں پچھیو جہڑا پردیس ما بیس کے بھی پل پل وطن نا یاد کریں تے بابا صاحب کا اسلوب ماء یاد کریں۔ منگلے اکے بن گئی ڈابگ ایا کشمیر کا اتھروں!
(رانا فضل حسین)

ہجر تے وچھوڑا کی جس کیفیت کو ذکر ذبیح، زار، مہجور تے قمر کی شاعری ما ہے اس کی ادائیگی ما خوبصورتی بابا صاحب کی شخصیت تے کرم کی نظر کو نتیجو ہے۔ ذبیح راجوروی ہوراں کا یہ شعر تے کس نے نئیں سُنیا:

الف: اللہ کو واسطو جا قاصد میرا یار نا میرو پیغام دے ا
میری روح تے جان دلگیر طرفوں بنھ کے ہتھ سلام کلام دے ا
کہنو رکھنو یاد پردیسیاں نا قسم واسطے رب کو نام دے ا
ذبیح یار نا اک حقیر تحفو میری زندگی عمر تمام دے ا

ب: بسار یئے نا میری جان مِناں میری زندگی تے میری جان توں ہے
میرا دل کو چین سکون سب کُجھ میرو مان تے روح روان توں ہے
توں ہی اک میری کائنات ساری دنیا اخرت دوئے جہان توں ہے
میرو نہیں کوئے جگ ماباجھ تیرے سب کُجھ ذبیح؟ کو دین ایمان توں ہے

اسے کیفیت تے عقیدت کو اظہار قمر راجوروی مرحوم نوں کریں:

ب: بخت میرا بیدار ہوتا کدے ہوں اجکل وانگت لار ہوتو
چُم چُم کے درو دیوار روتو کدے ہوں وچ پاک دربار ہوتو
اچھا بل ہو تو پہلگام ہوتو حضرت بل ہوتو شالیمار ہوتو

ہوتی شاہ نظام کی پاک مجلس قمر ہوں اس کو خدمت گار ہو تو

تے جے کدے اس کوڈ و جورُخ دیکھنو ہوے تاں اس سلسلہ ما گوجری ادب کی سب توں خوش قسمت شخصیت اقبال عظیم نا پچھیو جہڑا کہیں: کسے کا بانپھلاں پر پیہنگ جُھوٹوں، میری اُچی رسائی ہوگئی ہے!

بلا شبہ میاں اقبال بجران نا اُچی رسائی تے عظمت بخش کے اقبال عظیم بنان الی بابرکت شخصیت بابا صاحب کی ہی تھی۔ شاعراں کا ناں گنواناں یا شاعری کو احاطو کرنو ممکن بھی نہیں تے مقصد بھی پر اک گل کو اعتراف اوّ ایمان داری نال کرلیاں جے اک شخصیت تے اس دربار نے جتنا شاعر تے ادیب گوجری زبان کی جھولی ما باھیا ہیں، اُس کی مثال دنیا کی کائے دوجی زبان نہیں پیش کر سکتی۔ یوہ گوجری زبان کو دوجو معجزو ہے۔ پہلو یوہ کہ گوجری دنیا کی واحد زبان ہے جہڑی زمانہ کی بٹ مہری تے ظلم کے باوجود دس صدیاں تک زندہ رہی۔ لہٰذا یاہ گل وی یقین نال کہی جا سکے جے قدیم گوجری ادب ما جہڑ و مقام تے مرتبو امیر خسرونا حاصل ہے وہ جدید گوجری ادب ما حضرت میاں نظام الدین لاروی ہوراں تیں بغیر کسے نا نئیں سوبھتو۔ بقول علامہ اقبال:

رہے نہ ایبک وغوری کے معرکے باقی، ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو!

اخر 3 شوال 1391 ہجری نا جد گُجر قوم کی اساں تے امیداں کو یوہ چن غروب ہو یوتاں گوجری ادب کا پیر پنجال رانا فضل حسین راجوروی ہورا اپنی مشہور نظم "پیر پنجال کو چن" ما لکھی:

یوہ چن عید شوال کو چن رے، سب کو چن اک گگناں کو چن،
فضل نہ بنیو رب ہتھوں کوئے دراں کا مانجھال کو چن رے
میرو پیر پنجال کو چن رے میرا چن کے نال کو چن رے

تے نظم "لہولہو عید" ما و یہہ لکھیں:

بول پیار یا عید کا چناں تیں کت میرو میت چھپایو
لہولہو عید خوشیں تیں کر کے اوڈ کھیا ریا عید کا چناں
موتاں مار یا عید کا چناں درد کا بھار یا عید کا چناں

تصوف تے روحانیت کا ناں ور دنیا نے کئیں تماشا ہوتا دیکھیا ہیں۔ لیکن اس لاروی دربار کی دو بڑی خوبی یہ ہیں۔ اک تے یاہ جے اس دربار ما نشہ تے ناچ گانا جیہی کائے چیز نظر نیہہ اتی۔ دوجی بڑی خوبی یاہ جے شریعت تے طریقت کو جہڑ و توازن قران تے حدیث توں ثابت ہے وہ عام زیارتاں تے درباراں ما گھٹ ہی نظر اوے لیکن حضرت میاں نظام الدین لاروی؟ ہوراں نے اس

سلیقہ نال یوہ سلسلو نبھایو جے روحانی منزلاں ماکمال کے باوجود دنیا تیں کنارہ کشی نھیں کی بلکہ یوں سمجھ لیو کے دھرتی وررہ کے اشمان ناہتھ لایا۔ نبی پاک کی سیرت اپنی ذاتی زندگی ماوی اپنائی تے علمی، ادبی درس کے نال سماجی تے سیاسی مداناں ماوی برابر حصو لیو۔ بابا صاحب کا نو (۹) سپوت تھا جن ما میاں بشیر احمد، میاں غلام ربانی، میاں غلام جیلانی، میاں جنید نظامی، میاں اسماعیل، میاں عبدالرشید، میاں جاوید نظامی، میاں شبیر احمد تے میاں اشتیاق احمد شوق ہور شامل ہیں۔ موجودہ دور کا لوک، میاں بشیر احمد لاروی کی کوہ ہمالیہ جیہی سماجی تے سیاسی حیثیت، نالے جاوید نظامی ہوراں کی سماجی تے ادبی خدمت تیں واقف ہیں؛ جنید نظامی ہوراں کی علمی صلاحیت کو زمانہ نے اقرار کیو، میاں اشتیاق احمد شوق ہور گوجری ما بلند پایہ شاعر منیا جائیں تے باقی نظامی برادران کا روحانی مقام تیں و یہہ لوک چنگی طرح واقف ہیں۔ گویا انھاں نے دنیا تیں کنارہ کشی کے بجائے عام ادمی ہاروں دنیا داری نبھا تاں لوکاں نا اخرت کی تیاری کو عملی سبق سکھایو۔ دنیا کا ہر شعبہ ما انھاں کی اولاد کی موجودگی اسے سلسلہ ما شمار کی جا سکے۔

قدرت گو قانون ہے جے جس کھُوہ تیں لوک پانی پیتا رہیں وہ کدے نیہہ سُکتو۔ بابا جی صاحب کا روحانی سلسلہ کا اس دربار تیں وی علم، ادب تے تصوف کو جھڑ وفیض جاری ہو یو، اس کا اماہ وی سدو بہار ہو گیا۔ علمی تے ادبی سرگرمیاں کے نال نال قومی، دینی، ادبی، سماجی تے سیاسی خدمت کو سلسلو لگا تار جاری ہے، بلکہ اس ما مذید ترقی با دھو ہی نظر اوے۔ 10 اکتوبر 197 نا جد جی صاحب لاروی کا فرزند تے جانشین، حضرت بابا نظام الدین لاروی ہوراں کو وصال ہوؤ، تاں یہ ساریں ذمے داری انھاں کا بڑا صاحبزادہ میاں بشیر احمد لاروی ہوراں کا کندھاں ور اگئیں۔ حضرت بابا جی صاحب لاروی کا پوتا تے حضرت میاں نظام الدین لاروی ہوراں کا صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحب لاروی ہور ریاست جموں کشمیر کا سیاسی، سماجی تے علمی ادبی حلقاں ماں کسے تعارف کا محتاج نہیں۔ پچھلی اک صدی تیں زیادہ عرصہ تک اس خاندان نے قوم کی علمی تے سیاسی رہنمائی تیں علاوہ ادبی میدان ماں نمایاں رول ادا کیو ہے تے صحیح معناں ماں لاروی دربار کی ادبی خدمات پر اک مکمل تحقیق کی گنجائش تے ضرورت ہے۔

میاں بشیر احمد ہوراں کی پیدائش علاقہ وانگت کا پہلنا ڑ گراں ماں جی صاحب کا وصال تیں چار سال قبل 21 اکتوبر 1922 نا نھ ہوئی۔ تے وانگت ما ہی 15 اگست 2021 نا ان کی وفات ہوئی۔ انھاں کو بچپن جی صاحب کی روحانی شفقت ما نھ گزر یو۔ بنیادی تعلیم تیں علاوہ گھر کا علمی ادبی

ماحول تیں مُچ کجھ سِکھیو۔نوجوانی کا دور تیں ہی اپنا قبیلہ تے علاقہ کا سماجی معاملاں ما دلچسپی شروع کر لئی۔1965 ماں حج کا فریضہ تیں بعد جد بابا نظام الدین لاروی ہوراں نے سیاست تیں کنارہ کشی کر لئی تاں سیاسی ذمے داری وی میاں بشیر صاحب نا قبول کرنی پئی تے ویہہ 1967 تیں 1968 تک برابر ریاستی سیاست ما اسمبلی کا رکن وی رہیا تے عرصہ تک ریاستی وزیر کے طور وی ذمہ داری نبھائی۔1972 ماء بابا نظام الدین لاروی ہوراں کا وصال تیں بعد روحانی گدی وی سنبھالنی پئی تے یاہ ذمے داری انھاں نے خیر تے خوبی سنگ نبھائی۔

لاروی دربار ما ہون الی علمی تے ادبی مجلساں کی تاثیر بچپن تیں ہی ان کا دل پر تھی۔ جِت کئی بلند پایہ پنجابی تے گوجری شاعراں کو ان جان برابر لگو رہوئے تھو۔اس راہ انھاں نا بچپن تیں ہی کئی شاعراں کا شعر زبانی یاد ہوگیا تھا جھڑا اویہہ اکثر مجلساں ما سنا تا رہیں ہویں تھا۔اپ گھٹ شاعری کی ہے، پر.جی صاحب کی سی حرفی ،ملفوظاتِ نظامیہ، تے''اسرار کبیری'' تیں علاوہ بابا صاحب کو کلام انھاں نے''اشعار نظامی'' کا ناں نال ترتیب دیکے شائع کروایو، بلکہ دربار نال متعلق شاعراں کو کُل کلام جمع کر کے''نیر سمندر'' کا سلسلہ کے تحت کئی جلداں ما شائع کروایو۔یوہ اک شخص نہیں بلکہ برابر اک ادارہ کو کم ہے۔انھاں نے اپنی ذاتی زندگی کی سخاوت ادب ماں وی کُھل کے برتی ہے تے ادیباں تے شاعراں کی سرپرستی تے رہنمائی کی روائت ساری زندگی قائم رکھی۔اس نسبت نال حضرت میاں بشیر احمد لاروی ہوراں کا مریداں تے محبتیاں کی اک بڑی تعداد ریاست تے ملک تیں باہر تک وی ہے۔سماجی تے سیاسی خدمت کا سلسلہ ما بھارت سرکار کی طرفوں پدم بھوشن تے اقوام متحدہ ما ملک کی نمائیندگی کو اعزاز وی حاصل کیو،ریاست تے ملک کا کئی رہنماواں سنگ ان کا ذاتی تعلقات وی تھا۔لیکن اس سارا کئیں کے باوجود نہ علمی ادبی مجلساں کو سلسلو ٹھہرن دتو تے نہ دنیا سرور سوار ہون دتی۔گویا.جی صاحب کی وراثت کا حقدار ہون کو عملی ثبوت پیش کیو۔ان کا دربار ما وی ادبی مجلساں کو سلسلے جاری رہیو، اقبال عظیم، اسرائیل اثر،نسیم پونچھی،غنی عارف، اشتیاق شوق، ارشاد قمر تے منشاء خاکی ہوراں کی گوجری ادبی خدمات دراصل حضرت میاں بشیر احمد لاروی ہوراں کی صحبت تے مجلس کو ہی حاصل ہیں۔۔اس ما شک کی گنجائش نھیں جے جدید گوجری ادب کی شیرازہ بندی گو سب تیں زیادہ کم ،ریڈیو کشمیر تے جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی نے کیو ہے،لیکن تفصیلی جائز ولیو جائے تاں ان اداراں ما کم کرن الا تقریبا سب حضرات کو تعلق کسے نہ کسے صورت اس دربار نال ضرور رہیو ہے۔حضرت میاں بشیر احمد لاروی ? ہوراں نے شاعراں تے ادیباں کی سرپرستی تیں علاوہ اپ وی کجھ مختصر مگر

معیاری شاعری کی ہے۔ پیش ہیں گوجری کلام کا نمونا:

ج: جاکے پچھوں نجو میاں نا، ویہہ کہیں ات دِستو فال کُجھ نہیں
ویہہ کہیں جھلیا کے حیران ہو یو، تِناں اپنی شائد سمھال کجھ نہیں
دسیں ویہہ حساب ابجد سارا تیرا ڈھول نا تیرو خیال کُجھ نہیں
اُچی اسکی ذات بشیر سچی ،توں تے سوبھتو اسکے نال کجھ نہیں

د: ڈکھاں کا دسوں ہوں حال کس نا، محرم دلاں کا کرتا خیال کُجھ نہیں
دسوں ہجر کا کھول کے ماجرا کے، جانی سُنتا میرا سوال کُجھ نہیں
کہوں معاف کرو میرا عیب سارا، اپر سٹیا دلوں ملال کجھ نہیں
دھوکھا ہجر کا لگا بشیر مِنا، اتا یار میرا اُچھن حال کُجھ نہیں

1968 تیں بعد میاں بشیر احمد لاروی ہور سیاسی ذمے داری اپنا سپوت تے سابقہ ریاستی وزیر میاں الطاف احمد نقشبندی ہوراں نا سونپ کے پوری طرح روحانی علمی تے ادبی کماں ما مصروف ہو گیا۔ تے فر اپنی علمی تے روحانی مصروفیات کی وجہ تیں روحانی گدی وی اپنا وصال تیں پہلاں ہی اپنا نکا صاحبزادہ میاں الطاف احمد ہوراں نا سونپ چھوڑی تھی۔ جد کہ انھاں کا بڑا صاحب زادہ میاں سرفراز ہوراں نا دنیا اک نمائیندہ سماجی کارکن، تے خوش خلق شخصیت کے طور خوب جانے تے انھاں کی سخاوت تے غریب پروری کسے تیں پوشیدہ نھیں۔

میاں الطاف احمد (پیدائش 1957) ہوراں کو ناں جموں کشمیر کی سیاست ما اک معتبر ناں منیو جائے۔ ویہہ 1987 تیں لیکے برابر کنگن کشمیر تیں اسمبلی انتخاب جتیا ہیں۔ تے کئی بار ریاستی حکومت ما کابینہ درجہ کا وزیر رہیا ہیں۔ سیاست تے خاص کر کشمیر کی حکومت مارہ کے وی انھاں نے دولتی زلیخا تیں اپنو دامن بچا کے رکھیو جہڑ و کمال ہر کسے نا حاصل نیہہ ہوتو۔ یوہ انھاں کی خاندانی شرافت تے تربیت کی تاثیر کو ہی نتیجو ہے۔ اس تیں وی بڑی کمال گل یاہ جے انھاں نے اسقدر سیاسی مصروفیات ہوتاں وی علمی تے ادبی مجلساں کو سلسلو وی جاری رکھیو وو ہے تے انفرادی طور وی لکھاڑیاں، شاعراں تے باصلاحیت نوجواناں کی حوصلہ افزائی جاری ہے۔ بلکہ اپنا محبتیاں کے ذریعے انھاں کی سماجی خدمت کو سلسلو وی پوری ریاست ما پھیلیو وو ہے۔ ویہہ سلسلہ نقشبندیہ کے نال نال ہمعصر دینی شخصیات نال وی برابر رابطہ مارہیں بلکہ موجودہ دور کی فرقہ بندی نا مٹا کے دینی اتحاد واسطے وی عوام نا ریاست ما انھاں تیں بہتر متبادل نظر نیہہ اتو۔ اللہ تعالیٰ انھاں نا مذید

قومی، سیاسی، علمی تے ادبی خدمات کی توفیق بخشے!

ع خدا کرے کہ یہ پودا ہرا ہرا ہی لگے!!

داغستان کا مشہور شاعر رسول حمزاتوف لکھیں کہ "مھارا ماحول ماسب توں بڑی بددعا تے سب توں بڑی گال یاہ ہے جے: "خدا تجھے تیری مادری زبان سے محروم کردے" اللہ جانے ہم نا یاہ کس کی بددعا لگتی جائے لگی وی۔ میری دعا ہے کہ خدا گجر سپوتاں نا اپنی مادری زبان نال بے لوث پیار کی توفیق نصیب کرے! ہندوستان کی اک قدیم، معتبر تے علمی ادبی زبان گوجری سرکاری ڈاہی نہ ہون کی وجہ تیں صدیاں تک گم رہن کے بعد بابا جی صاحب کے ہتھوں دوبارہ زندہ ہو کے اج اس زبان کو یوہ حال ہے جے یاہ بلوچستان، پشاور، راول پنڈی، مظفراباد، تر ڑکھل، کشمیر، جموں، پونچھ، کٹھوعہ تے شملہ کا ریڈیو سٹیشناں توں بولی جان الی گوجری زبان افغانستان توں لے کے بنگلہ دیش تک سمجھی جان الی زبان، گجرات تیں کشمیر تک بولی جان الی زبان جس کی اپنی ڈکشنری ہے، اپنی گرائمر ہے، اپنی سنہری تاریخ ہے، سکولاں کالجاں تے یونیورسٹیاں ما پڑھائی جائے۔

مختصر طور یاہ گل یقین سنگ کہی جا سکے جے، گوجر قوم، گوجری زبان تے ادب پر بابا جی صاحب کا تے لاروی دربار کا احسان گنایاں نھیں مکتا تے چُکایاں نئیں چکتا، پر ان کو اعتراف کرن کو بہترین طریقو یوہ ہی ہے جے اپنی ماں بولی کا وقار واسطے ہم سب رل کے کوشش کراں، اپنا اپنا قضیہ کنی رکھ کے، اپنا اختلاف مٹا کے نہ سہی بھلا کے ہر قربانی دین واسطے تیار ہو جاں تے ہر وہ شخص جس نے گوجری ماں کو دودھ پیوو ؤ ہے یوہ عہد کراں جے ہم اپنی ماں بولی واسطے کم از کم زبان کا مسئلہ ما اک جُٹ ہو سکاں۔ ہوں سمجھوں جے بابا جی صاحب نا عقیدت پیش کرن کو بہترین طریقو یوہ ہی ہے جے ان کا دربار کی سرکاری زبان نا، ان کی ماں بولی نا، اپنو جائز مقام دوان واسطے کوشش کی جائیں جہڑی وقت کی سب توں بڑی ضرورت بھی ہے۔ ورنہ کل کو تاریخ دان کسے کو لحاظ نہیں کرسیں۔ بابا جی صاحب لاروی تے اس لاروی دربار سنگ عقیدت گو سب تیں بہتر تے مناسب قدم تے یوہی تھو جے ات اُنھاں کا ناں پر کوئے بڑو ادارو یا یونیورسٹی قائم ہو جاتی (کاش!)

میرو کم ہے دعا کرنی دلوں لے کے زباں توڑی
نکل کے میرا ہوٹھاں تیں دعا جانے خدا جانے

☆☆☆

Naseem Hejazi ki Tarikhi Novel Nigari by Shahnavaj Ansari(research Scholar,dept. of urdu, Banaras Hindu University, Varanasi)
شاہنواز انصاری (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری

نسیم حجازی اپنے عہد کے مقبول صحافی اور بلند پایہ ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم شخصیت کے مالک بھی تھے، نسیم حجازی کی شخصیت کو متاثر کرنے میں سب سے اہم سبب گورداس پور سے نسبت ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے مشرقی پنجاب میں یہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ راوی اور بیاس دریاوں سے نزدیک تر ہونے کے سبب اس علاقے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے تقسیم ہند کے بعد جب یہ علاقہ ہندوستان کے زیر تحت آ گیا تو نسیم حجازی کو اس علاقے سے دوری کا گہرا صدمہ پہنچا۔ ان کی شخصیت اس سانحہ سے کافی متاثر ہوئی۔ ان کی بعض تخلیقات میں ان کی قلبی واردات کا اظہار سامنے اتا ہے جغرافیائی دور کی تغیر وتبدل سے دوملکوں کے دوران جو خطہ کشیدہ مقرر ہوا اور مسئلہ کشمیر کی حدود کا تعین کسی اعتبار سے نہ ہو سکا۔ جس کا علم نسیم حجازی کے ناول ''خاک وخون'' کے اخری صفحات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ جہاں نسیم حجازی نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس مسئلے کا حل بات چیت اور کانفرنسوں کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔ نسیم حجازی کے بعض ناولوں میں تقسیم ملک سے متعلق کئی واضح علامتی انداز میں اشارے مل جاتے ہیں اس طرح کئی ایسی وجوہات ہیں جنھوں نے نسیم حجازی کی شخصیت کو نئے موڑ دیئے اور ایک الجھاو کی کیفیت ان کی طبیعت میں پیدا کر دی۔

نسیم حجازی کو قدیم اور عصری تاریخی مطالعے کا گہرا شوق تھا ان کے مطالعے کا یہی شوق اگے چل کر صنف ناول نگاری سے ابھرتا ہوا نظر اتا ہے ان کے تقریباً تمام ناولوں کے موضوع کسی نہ کسی خاص تاریخی واقع سے منسلک ہیں۔ نسیم حجازی ہمدرد، اخلاص محبت کا پیکر تھے۔ ہمت، دلیری اور مردانہ جرات ان کی ذات کا ایک اہم وصف تھا۔ اس لئے ان کی تخلیقات میں بہادر، نڈر، اور حوصلہ مند شخصیات کا تذکرہ زیادہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے لئے فقط ان ہی شخصیات کا انتخاب کیا جن میں مذکورہ بالا صفات پائی جاتی تھیں۔

اردو ناول کی تاریخ میں نسیم حجازی کا مقام ایک انفرادیت کا حامل ہے وہ نہ صرف ایک اچھے ناول نگار ہیں بلکہ اسلامی عہد اور تاریخ کے سیر و ردہ اور مورخ بھی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف تاریخ ساز شخصیتوں پہ ناول لکھے ہیں بلکہ تاریخی مقام اور واقعات کی ایک طویل تاریخ بھی مرتب ہے۔ تاریخی ناولوں کے علاوہ انھوں نے تہذیب، ثقافت، اور خودنوشت ناول بھی لکھے جو ان کی زور قلم اور زورِ طبیعت کی واضح نشانی ہیں۔ ان کے ناول اسلام کی اصل روح کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے تاریخی ناول لکھ کر قاری کو اپنے ماضی کی طرف جھانکنے اور مائل کرنے میں ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے تاریخی واقعات کو جس طرح وقت اور زمانے کے خدوخال کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ایسے شاید ہی کوئی ناول نگار کامیاب ہو پائے گا۔ ڈاکٹر شریف احمد تاریخی ناول کی تعریف کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''تاریخ اور ناول میں کوئی خون کا رشتہ نظر نہیں اتا۔ ایک کی عمر ہزاروں سال پہنچ چکی ہے۔ جبکہ دوسرا اپنا سلسلہ نسب بتانے کے لئے ماضی میں کتنا بھی پیچھے کو بھاگے چند صدیوں سے اگے نہیں جا سکتا۔ پھر ایک علم ہے دوسرا فن۔ لیکن اگر ہم ذرا تامل اور توقف سے سوچیں تو ادب کی دنیا میں یہ کوئی اچھا نہیں۔ علوم بنی نوع انسان کا ذہنی یا روحانی اکتساب ہے۔ انھیں پر تمدن اور تہذیب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے"1۔

اردو میں جتنے بھی تاریخی ناول لکھے گئے ہیں چاہے وہ فنی لحاظ سے کمزور ہی کیوں نہ ہوں لیکن ان میں تہذیب وتمدن کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ عبدالحلیم شرر سے لے کر تا حال تاریخی ناولوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جس میں مختلف سلطنتوں، بادشاہوں، عظیم شخصیتوں اور حالات وواقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان سے ہماری ایک لمبی تہذیبی روایت محفوظ ہوتی نظر آ رہی ہے اور نئی نسل کو اپنے اباواجداد اور اپنے سے ماقبل عہد کی تہذیب۔ معاشرت، تمدن اور سماج کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے۔ تاریخ ناول اردو زبان وادب کا ایک عظیم ورثہ ہیں جن پر اردو داں طبقہ کو فخر ہے۔ علی احمد فاطمی تاریخ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''تاریخ دراصل اپنے ماضی کی طرف دیکھتی ہوئی مڑتی ہوئی ایک دنیا ہے۔ بعض گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنا، یاد کرنا اور پھر یادوں کو محفوظ رکھنا ہی تاریخ ہے۔ تاریخ سے متعلق اس امر پر کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ تاریخ ماضی کی جانب مڑ کر دیکھنے کا ایک عمل ہے۔ لیکن ہم ماضی کی طرف مڑ کر کیوں دیکھتے ہیں؟ یہیں پر ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے جس کی وضاحت لازمی ہے۔

ماضی کی جانب مڑ کر دیکھنے اور تاریخ کی کھوج اور تلاش کرنے کے عمل میں دراصل موجودہ زندگی کے اضطراب کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کی خواہش بھی اسے ماضی کی دنیا میں لے جانے پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں پر ایک بات کی وضاحت اور ضروری ہے کہ صرف ماضی کی طرف پلٹنے کی بات کو بہت اچھے معنی نہیں پہنائے جاسکتے۔ ۲

نسیم حجازی نے اپنے ناولوں کے لئے جس زبان، اور اسلوب کو اختیار کیا وہ واقعی دادِ تحسین کا مستحق ہے۔ تاریخی ناول لکھنا اور اس میں زبان و اسلوب کی طرف توجہ دینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اردو ادب کے قدیم بیشتر تاریخی ناول اس فنی خصوصیت سے محروم ہیں۔ نسیم حجازی کا اسلوب بالکل معاشرتی ناولوں سے مختلف ہے۔ ان کے بعض ناولوں میں خفیف سا رومانی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ باقی بیشتر تاریخی ناول نگاروں میں نسیم حجازی کا اندازِ اسلوب اور زبان و بیان کا استعمال واضح طور پر منفرد ہے۔ نسیم حجازی نے نہایت ہی سادہ، سلیس اور عام فہم اور جچی تلی زبان کو برتا ہے زبان و بیان کے اعتبار سے نسیم حجازی کی تخلیقات کا رشتہ عام قارئین سے جڑا ہوا ہے۔ نسیم حجازی نے جس طرح خشک تاریخی واقعات کو عام اور روزمرہ میں استعمال کی جانے والی زبان کو ناولوں میں برتا ہے یہ ان ہی کا کمال ہے۔ وقت اور ضرورت کے مطابق نسیم حجازی نے دیگر زبانوں کے ساتھ الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو ہر زبان کا قاری اسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

مختصر الفاظ میں ہم نسیم حجازی کی تخلیقات کو مدنظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی مقصد کے تحت تخلیق کی گئی ہیں۔ ان کے ناولوں کا ایک خاص مقصد واضح طور پر یہ ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے نوجوان طبقہ کو ماضی میں رونما ہونے والے واقعات۔ اہم شخصیات کے کارنامے اور جد و جہد سے اشنا کرانا ہے۔ دوسرا اہم مقصد مٹتے ہوئے تاریخی حقائق کو ناول کی شکل میں از سرِ نو زندہ کرانا ہے اور تیسرا مقصد اصلاح قوم ہے۔ نسیم حجازی کی تخلیقات کا ایک اہم مقصد یہ بھی رہا ہے کہ وہ تاریخی ناول نگاری کی روایت کو مستحکم و پائدار بنائے تا کہ ائندہ نسلیں اس روایت کو اسانی سے اگے لے جاسکیں۔

داستانِ مجاہد:

''داستانِ مجاہد'' نسیم حجازی کا پہلا تاریخی ناول ہے جو 1943 میں منظر عام پر ایا۔ اسی ناول کی اشاعت سے نسیم حجازی؟ کے تاریخی ناولوں کا لمبا سفر شروع ہوتا ہے۔ پندرہ ذیلی عنوان اور دو سو تیس صفحات پر مشتمل یہ ناول تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد 75ھ سے 125ھ تک کے واقعات کا

احاطہ کرتا ہے۔اس ناول میں قلم بند کئے گئے تاریخی واقعات تاریخی ائینے میں حقیقت کے بہت قریب ہیں۔ اس ناول کے مطالعے سے نسیم حجازی کا مطالعہ تاریخ اسلام کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔قدیم تاریخی واقعات وحقائق کوایک ناول کی شکل میں پیش کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔اس ناول کومنظر عام پر لانے کا پس منظر نسیم حجازی نے خود ہی اسی ناول کے پیش لفظ میں واضح الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

''داستان مجاہد'' کی ابتدا ایک افسانے سے ہوئی۔ 1937 میں مجاہد کے عنوان سے ایک افسانے کا پس منظر تلاش کرنے کی غرض سے میں نے تاریخ اسلام اٹھائی مجھے داستان ماضی کا ہر صفحہ ایک دل کش افسانہ نظر ایا۔اس رنگین داستان کی جاذبیت نے افسانہ لکھنے کے ارادے کو تاریخ اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے شوق میں تبدیل کر دیا۔ایک مدت تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ تاریخ اسلام کے کس واقعہ کو اپنے افسانے کی زینت بناوں۔میں کسی ایک پھول کی تلاش میں ایک ایسی سرسبز شاداب وادی میں پہنچ چکا تھا جس کی اغوش میں رنگارنگ کے پھول مہک رہے تھے۔دیر تک میری نگاہیں اس دلفریب وادی میں بھٹکتی رہی اور میرے ہاتھ میں ایک پھول کے بعد دوسرے پھول کی طرف بڑھتے رہے۔میں نے رنگارنگ پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا۔اج میں ان پھولوں کو ایک گلدستے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔اگر اس گلدستے کو دیکھ ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اس وادی کی سیاحت کا شوق اور اپنے خزاں رسیدہ چمن کو اس وادی کی طرح سرسبز شاداب بنانے کی ارزو پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی محنت کا پھل مل گیا۔ ۳

اس ناول کی کہانی کا اغاز مصنف نے ملک عراق کے تاریخی شہر بصرہ میں رہنے والے ایک گھرانے سے کیا ہے۔جس میں عذرا نام کی ایک لڑکی جس کا باپ جنگ میں شہید ہو چکا ہوتا ہے۔اس کی والدہ اس کے باپ کے شہادت کے بعد بھی زندہ نہ رہ سکیں۔اس کی پرورش ان ہی کے گھر میں رہ رہی ایک خاتوں صابرہ کے ہاتھوں ہونا شروع ہوتی ہے۔صابرہ کے دو بیٹے عبداللہ اور نعیم بھی اپنا بچپن عذرا کے ہمراہ گزار رہے ہوتے ہیں عبداللہ نعیم کا بڑا بھائی ہے۔عذرا عبداللہ کے سامنے تکلف اور حجاب میں رہتی جبکہ نعیم اور عذرا اپس میں ایک دوسرے کے اچھے دوست کی طرح رہتے۔

عبداللہ جہاد پر جانے سے پہلے جب اپنے گھر پر اتا ہے تو عذرا اس وقت جوانی کے دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔عذرا عبداللہ سے ہمیشہ پردے اور تکلف سے ملتی تھی۔عبداللہ جب جہاد کے لئے گھر سے رخصتی کے وقت ماں سے دعا کرواتا ہے۔تو عذرا بھی دعاوں کے ساتھ اپنا رومال پیش کرتی

ہے۔عبداللہ کی ماں سربسجود ہوکر بارگاہ الٰہی میں عبداللہ کے لئے دعا کرتی ہے۔کچھ عرصہ کے بعد جنگ سے واپس ہوکر عبداللہ جب گھر آتا ہے تو عبداللہ کے ماموں عذرا اور عبداللہ کی شادی کروانے کی تجویز پیش کی۔اس بات کی خبر جب نعیم کو ملتی ہے تو وہ اداس اور غمگین ہوجاتا ہے مگر اپنے بھائی کے خوشی میں وہ کوئی دخل اندازی نہیں کرتا۔

نعیم جب واپسی اختیار کرکے روانہ ہوتا ہے تو اسے دورانِ سفر سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔سفر میں ایک شخص کے بہکاوے میں آکر نعیم اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔مگر جب نعیم ہوش میں آتا ہے تو خود کو ایک اندھری کوٹھری میں پاتا ہے۔ایک دن جب اسے ابن صادق کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اسے سارے معملات کا پتہ چلتا ہے ابن صادق اسے دنیاوی لالچ دے کر اپنے ساتھ لینا چاہتا ہے۔مگر نعیم اس کی ایک بھی نہیں سنتا اسے سخت اذیتیں بھی دی جاتی ہیں۔

ادھر دوسری طرف عبداللہ پانچ ہزار فوج لے کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کرتا ہے۔جب اسے نعیم کی گرفتاری کی خبر ملتی ہے تو وہ ابن صادق کو پکڑ کر نعیم کو رہا کروالیتا ہے۔اسی دوران امیر المونین کا خط نعیم کو موصول ہوتا ہے جس میں نعیم کے لئے گورنری اور ابن صادق کو قید کرکے دمشق بھیجنے کا حکم ہوتا ہے۔ابن صادق راستے میں زہر کھا کر خودکشی کرلیتا ہے۔اس کے بعد نعیم تقریباً اٹھارہ سال گورنر رہنے کے بعد بربریوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اس بغاوت میں نعیم سخت زخمی ہوجاتا ہے۔کافی عرصہ علاج ومعالجہ کرانے کے باوجود بھی طبیعت میں کچھ سدھار نہیں ہوئی۔ہمت وحوصلہ کرکے وہ اسی زخمی حالت میں اپنے گھر پہنچ جاتا ہے۔اس کے بعد وہ اپنے دونوں بھتیجوں کو جہاد کے لئے تیار کرتا ہے اور جب وہ جہاد کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو نعیم پہاڑ کے ایک ٹیلے پر چڑھ کر سجدہ کرتا ہے اسی دوران وہ بے ہوش ہوجاتا ہے۔عذرا کی بیٹی پانی لاکر اس پر چھینٹے ڈالتی ہے اور نعیم ہوش میں ا؟ جاتا ہے پھر پانی پیتا ہے اور کلمہ شہادت پڑھ کر کچھ باتیں کرنے کے بعد اس دنیا فانی کو چھوڑ جاتا ہے اور نعیم کی موت پر ہی ناول کا اختتام ہوجاتا ہے۔

ناول ''داستان مجاہد'' بنیادی طور پر محمد بن قاسم کی تاریخ ساز شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کئے ہوئے ہے ابتدا سے اخر تک محمد بن قاسم کی زندگی اور حالات وواقعات کے تئیں ان کی مدبرانہ جدو جہد کو موضوع سخن بنایا ہے۔یہ ناول ہندوستان میں مسلمانوں کی امد اور اس کی وجوہات کے ایک عظیم سلسلہ کا پیش خیمہ ہے۔محمد بن قاسم حجاج بن یوسف کا داماد تھا۔جس کے ہاتھوں ہندوستان میں مسلمان کی فتح کا سلسلہ شروع ہوا۔بادشاہ داہر کی غیر انسانی فعال میں بدلنے کے لئے جو کام محمد بن قاسم نے کیا

وہ تاریخی کے اوراق میں سنہرے حرفوں میں لکھا گیا۔نسیم حجازی یہ ناول لکھ کر کرامتِ مسلمہ کو تاریخ کے ان گوشوں سے متعارف کرایا جن پر مورخین کی بہت کم توجہ جاتی ہے۔تجسس اور انہماک کی جو کیفیت قاری کو دوران مطالعہ نصیب ہوتی ہے وہ نسیم حجازی؟ کے تاریخی حقائق کو واضح کرتا ہے۔ جہاں تک اس ناول پلاٹ کا سوال ہے تو یہ ناول ربط و تسلسل اور دلچسپ واقعات کی وجہ سے ایک بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ناول میں واقعات کو اس خوبی اور تخیل سے پیش کیا گیا ہے قاری تجسس کے ان منازلوں میں سیر کرتا ہے جہاں اسے جذبات کی وہ روشن کرن نصیب ہوتی ہے جو اس کے ایمان کو پختہ کرتی ہے۔نسیم حجازی؟ نے اس ناول کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کا ایک دوسرے کے ساتھ تاریخی واقعات کے تسلسل کا ایسا تعلق قائم کیا جس کو پڑھتے وقت قاری کو کبھی بھی شبہ نہیں ہوتا۔ناول نگار نے کرداروں ،واقعات اور حالات کا ایک ایسا تسلسل پیش کیا ہے کہ قاری متجسس ہو کر مزید انہماک سے خود کو ناول کا ایک حصہ سمجھ بیٹھتا ہے۔

حواشی:

(۱)عبدالحلیم شرر:شخصیت اور فن،ڈاکٹر شریف احمد،ص:21

(۲)عبدالحلیم شرر:بحیثیت تاریخی ناول نگار،علی احمد فاطمی،ص:۱۵۱

(۳)داستان مجاہد:نسیم حجازی۔ادبی دنیا ٹیا محل۔ص:۵

☆☆☆

Makhdoom Mohiyuddin ki nazm "Chand Taaron ka Ban" ka tanqidi aur tajziyati Mutalea by Shabnam Ansari(Research Scholar,dept. of Urdu,Banaras Hindu University, Varanasi)

شبنم انصاری (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی)

مخدوم محی الدین کی نظم" چاند تاروں کا بن" کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ

مخدومؔ محی الدین بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔انھوں نے ۱۹۳۳ء سے شاعری کی ابتدا کی اور پھر ترقی پسند تحریک سے منسلک ہو گئے۔ان کو ترقی پسند شعراء میں ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔انھوں نے ترقی پسند تحریک کے دورِعروج میں اپنی نظموں کے ذریعہ کافی شہرت حاصل کی۔ نظموں کے علاوہ غزلیں بھی کہیں لیکن ان کی تعداد محض ۲۱ ہے۔مخدومؔ محی الدین نے جب اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تو اس وقت میدانِ شاعری میں اقبالؔ اور جوشؔ چھائے ہوئے تھے۔ایک جانب اقبالؔ کی پیامی شاعری اہلِ وطن کو جدوجہد وحوصلہ مندی کا درس دے رہی تھی تو دوسری جانب جوشؔ کی بلند آہنگی، ان کے لہجہ کی گھن گرج اور للکار انگریزی حکومت کے ایوانوں میں لرزاں پیدا کر رہی تھی۔ مخدومؔ نے اگرچہ اقبالؔ اور جوشؔ دونوں کا اثر قبول کیا لیکن اقبالؔ سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا۔اس کا اظہار ان کے پہلے شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' میں شامل نظم 'اقبال' سے ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز عشقیہ اور انقلابی جزبات کے سہارے کیا۔

مخدومؔ کی شاعری میں رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ان کی شاعری قومی یکجہتی اور وطن پرستی کی ترجمان ہے۔مخدومؔ پرانے اور فرسودہ سماجی ومعاشی نظام کو بدلنے کی خواہش رکھتے تھے اور سماجی عدم مساوات کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔وہ ایک سچے محبِ وطن کی طرح انقلاب اور آزادیِ ہند کے سچے مجاہد تھے۔مخدومؔ کا شمار ان گنے چنے شاعروں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے نہ صرف آزادی کے گیت گائے بلکہ انقلاب لانے کے لئے عملی طور پر اس میں شریک بھی ہوئے۔سیاسی وسماجی موضوعات اور ہنگامی مسائل پر نظمیں لکھنے کے علاوہ انھوں نے عشقیہ اور رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں جن کا شمار ان کی کامیاب نظموں میں ہوتا ہے۔ان کی اس طرح کی نظموں میں

عریانیت کا سایہ بھی نہیں پڑتا ہے۔ انھوں نے جہاں محبت کے گیت گائے ہیں وہیں آزادی کے ترانے بھی اردو شاعری کو دیے ہیں اس لیے انھیں ''محبت اور محنت'' کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔

مخدومؔ کا شمار ایسے نظم گو شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے مقصدیت کو فن پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ جس طرح محبت اور عورت کے تئیں بے حد نرم اور احترام کا رویہ رکھتے تھے، وہی رویہ ان کا فنِ شاعری کے ساتھ بھی تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر مقصدیت کے تحت کی گئی شاعری میں واعظانہ اور خطیبانہ لہجے کا اثر پایا جاتا تھا اور ادب برائے زندگی کے پرچم تلے فنی خصوصیات دب کر رہ گئی تھیں مگر اس دور میں مخدومؔ نے مقصد اور موضوعات کو برتنے میں شعری لوازمات کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ لہٰذا بغاوت نے ان کی شاعری کو پروپیگنڈہ نہیں بننے دیا۔ انھوں نے خطابت، واعظانہ انداز اور کرخت لب ولہجہ سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ہے۔ چونکہ ان کی بیشتر نظمیں سیاسی نوعیت کی ہیں لیکن وہ انقلاب کے جوش میں فن کی لطافت کو قربان نہیں کرتے بلکہ اس کی شگفتگی اور نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے رومانیت اور نغمگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ مخدومؔ کی نظم نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں سرخ پرچم، مزدور، تلنگانہ، بنگال، نئی صبح، آزادی یا انقلاب کی آواز بلند نہ کی ہو۔ ان کے یہاں بھی واضح الفاظ میں بعض نظموں میں ان کا ذکر ہے اور زریں لہر کی شکل میں بیشتر نظموں بلکہ پوری شاعری میں انھیں خیالات کی کارفرمائی ملے گی۔ ان کے سیاسی کمٹ منٹ، ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کے تعلق اور تحریک آزادی کا پایا جانا ایک فطری بات ہے۔ لیکن توجہ کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ان کی بیشتر نظموں کی شناخت ان کا جمالیاتی کیف اور احساسِ جمال ہے۔''

چنانچہ مخدومؔ کے شعری اوصاف میں جو نکات وخصوصیات سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئیں، وہ ان کے لہجے کی غنائیت، مخصوص آہنگ اور لسانی شعور ہے۔ ان کی نظموں میں ان خصوصیت کو بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسے مستحکم تخلیقی شخصیت کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم نے قتل و غارت گری کے زمانے میں بھی اپنی شعری خصوصیات اور اس کے رنگ و آہنگ پر حرف آنے نہیں دیا۔ اس نظم وضبط کی جھلک ان کی نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے نعرے کو نغمہ بنا کر پیش کر کے شاعرانہ فن کاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

مخدومؔ محی الدین کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''سرخ سویرا'' (1944)''

گل تر''(1961)اور''بساط رقص''(1966)۔ان کا پہلا مجموعہ سرخ سویرا تقریباً ان کی دس سال کی فکری وفنی کاوش کا نتیجہ ہے۔اس شعری مجموعے میں ایسی نظمیں شامل ہیں جن میں رومانی اور انقلابی فکر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔سرخ سویرا کی اشاعت کے ساتھ مخدومؔ عملی طور پر سیاست کے میدان میں سرگرم ہو گئے تھے اس لئے ایک عرصے تک وہ شاعری کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔اس کے بعد ان کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے،جس میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام''گلِ تر''منظر عام پر آتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے بڑی اچھی اور حسین نظمیں لکھیں مثلاً 'چارہ گر، چاند تاروں کا بن، وقت، بے درد مسیحا، خواہش، لختِ جگر، سناٹا اور وادی فرد اوغیرہ۔اگر چہ یہ نظمیں انقلابی شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔لیکن 'چاند تاروں کا بن' جیسی نظم میں شاعر کا اندرونی کرب، احساس وآرزومندی کا جذبہ اور حقیقت نگاری جھلکتی ہے۔مخدومؔ محی الدین نے اپنے اس دور کی شاعری میں شاعرانہ اظہار کو بہت اہمیت دی ہے۔نغمگی اور موسیقیت کا عنصر شروع سے لے کر آخر تک ان کی شاعری میں موجود ہے۔

مخدومؔ محی الدین کی نظم''چاند تاروں کا بن''۱۹۵۸ میں لکھی گئی جو ان کے دوسرے مجموعے''گل تر''میں شامل ہے، جو 1961 میں شائع ہوا۔ان کی نظم''چاند تاروں کا بن''ہندوستانی سیاست پر لکھی گئی بہترین نظموں میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔انھوں نے اس نظم میں ذیلی عنوان ''آزادی سے پہلے، بعد اور آگے''دیا ہے۔نظم کو اسی ترتیب سے ہم تین حصوں میں پڑھ سکتے ہیں کہ وطن کی آزادی کے لیے ہمارے جانبازوں نے کیا کیا قربانیاں دیں، اپنی جانیں خوشی خوشی نچھاور کیں، اپنی خوشیاں اپنی سرمستیاں اور بانکپن سب کچھ لٹا دیا لیکن تشنگی میں بھی شرشار رہے کیونکہ ان کی نظروں کے سامنے عزم آزادی کی منزل تک پہنچنا تھا۔اس طرح اس نظم کا موضوعاتی کینوس بہت وسیع ہے لیکن مخدومؔ نے اختصار اور جامعیت سے کام لیتے ہوئے اس نظم میں ہندوستان میں جدوجہد آزادی اور حصول آزادی کے بعد کے ہنگاموں کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔

''چاند تاروں کا بن''اردو کی سیاسی وانقلابی شاعری کی ایک بے حد عمدہ مثال ہے۔اس میں جذبۂ فکر اور نظریہ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک ایک لفظ تاثر میں ڈوبا ہوا ہے۔پیرائے اظہار کی وجہ سے یہ ایک اچھوتی اور متاثر کن نظم ہے۔نظم کا لہجہ انقلابی اور پر جوش نہیں ہے۔انھوں نے روایتی نعرہ بازی سے کام نہیں لیا ہے۔مخدومؔ ترقی پسندوں کے کارواں میں شامل تھے لیکن اپنے منفرد انداز کی بنا پر سب سے الگ تھلگ تھے۔ان کی آواز منفرد تھی،''چاند تاروں کا بن''اس کی بہترین مثال ہے۔انھوں نے اس نظم میں موضوع کو جس ضبط، وقار، احتیاط اور آہنگ کے ساتھ برتا ہے اس کو

دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں یہ سب سے عمدہ نظم ہے۔اس نظم میں ان کی سیاسی وعوامی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔نظم ''چاند تاروں کا بن'' آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔اس نظم کے ابتدائی چند مصروں میں شاعر نے تحریک آزادی کے پورے منظر نامے کو بڑی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ملک کو برتانوی حکومت سے آزادی دلانے اور ملک سے غلامی کا اندھیرا دور کرنے کے لیے مجاہدینِ آزادی نے ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا لیا۔ان کے پیشِ نظر صرف یہی مقصد تھا کہ ملک کو غلامی کی تاریکی سے نجات دلائی جائے۔نظم کے پہلے ہی مصرعے میں شاعر نے بڑی خوبصورتی سے شہیدوں کی قربانیوں کو موم کے جلنے سے تشبیہ دی ہے:

''موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن''

چونکہ مجاہدینِ آزادی کے مقصد کی تکمیل ابھی نہیں ہوئی تھی اس لئے صبحِ وطن کی شمع جھلملا رہی تھی۔سبھی لوگ صبحِ آزادی کا نظارہ دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔مخدومؔ کی بیشتر نظموں میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش جگمگاتی نظر آتی ہے اور ان کے ہر لفظ سے آزادی واخوت کا جذبہ جھلکتا ہے۔ان کی ایسی نظمیں حب الوطنی،قومی یکجہتی اور انسان دوستی کے مقدس جذبات سے لبریز ہیں اور آزادی وطن کی منتظر نظر آتی ہیں۔مجاہدینِ آزادی کی کوشش کے بعد ہمیں آزادی تو مل گئی لیکن یہ وہ نظارہ نہیں تھا جس کے سب منتظر تھے۔یہ آزادی کشت وخون کا ایک سیلاب اپنے ساتھ لے کر آئی، جس نے ہندوستان کو دہلا کر رکھ دیا۔مذہب کے نام پر لوگوں کا قتل ہوا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ تقسیمِ ہند کا سانحہ بھی پیش آیا۔جس کی وجہ سے آزادی کے فوراً بعد ہزاروں لاکھوں انسان فرقہ وارانہ فسادات کے نذر ہو گئے۔برسوں کی محبت اور رواداری نفرت کی آگ میں تبدیل ہو گئی۔ایک ہی ملک میں بھائی بھائی کی طرح رہنے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے لوگ اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔چند دنوں پہلے تک جو خون ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہا کرتا تھا وہی اب آپسی نفرت کے اظہار میں بہایا جانے لگا۔مخدومؔ اپنی اس نظم میں اس الم ناک واقعہ کا ذکر بے حد پر درد لہجے میں کرتے ہیں:

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن — صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے — رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا — کچھ امامانِ صد مکر وفن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی — ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں

ایک کمیں گاہ سے پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

حصول آزادی سے پہلے لوگ انگریزوں کی غلامی میں اذیتیں برداشت کرنے پر مجبور تھے لیکن آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ تھوڑی سی بدلی ہوئی صورت میں جاری ہے۔ انگریزوں کے بعد ہندوستان کی حکومت چند لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی اور وہی لوگ پوری قوم کے استحصال میں مصروف ہو گئے۔ ظاہری طور پر تو ایسے لوگ اپنے آپ کو عوام کا بہتر رہنما پیش کرتے ہیں لیکن باطنی طور پر وہ سانپ سے بھی زیادہ زہریلے ثابت ہوئے۔ ان کی زبان پہ تو میٹھے میٹھے بول ہیں لیکن ان کی سانس میں ناگ کی پھنکار شامل ہے۔ شاعر کا یہ خیال بہت مناسب ہے کہ ہمیں آزادی تو مل گئی تھی لیکن جس طرح کی آزادی کا ہم نے تصور کیا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔

مخدومؔ کی اس نظم کا ٹھیک وہی موضوع اور وہی لہجہ ہے جو موضوع اور لہجہ فیض کی نظم 'صبحِ آزادی' کا ہے۔ اس موضوع کو فیض اپنی نظم 'صبحِ آزادی' میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار، کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

نظم کے آخری مصروں میں مخدومؔ ان ناسازگار حالات کو پیش کرتے ہوئے اپنے حوصلے کے بل پر ان حالات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اہلِ وطن کو محبت و بھائی چارگی کو بحال کرنے اور امن قائم کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ کیونکہ جنگ و جدل سے کچھ حاصل نہیں بلکہ آپسی اتحاد اور قومی یکجہتی میں ہی سب کی ترقی اور خوشحالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مستقبل کا سفر بے حد دشوار ہے اور ان دشواریوں پر قابو پانے کے لئے ہمیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ نظم کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

ہمدمو ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی کوئے دل دار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

مخدومؔ افراتفری کے اس سخت گھڑی میں بھی حوصلہ نہیں ہارتے ہیں اور اہلِ وطن کو بھی حوصلہ دیتے ہیں۔ حب الوطنی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

مخدومؔ کی اس نظم کا حسن اس کی رمزیت میں چھپا ہوا ہے۔ اگر اس نظم میں ذیلی عنوان

''آزادی سے پہلے، بعد اور آگے'' نہ لکھا ہوتا تو اس نظم کو سیاسی کہنا بھی مشکل ہوتا۔

نظم کا عنوان ''چاند تاروں کا بن'' خود ہمیں غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ رات کی سیاہی میں چاند تاروں کی جھرمٹ روشنی کی علامت ہے۔ چاند تاروں کے بن سے مراد ہم ان مجاہدینِ آزادی سے لے سکتے ہیں جو غلامی کے اندھیرے میں چاند تاروں کی مانند آزادی کی امید اور روشنی بکھیر رہے تھے۔ اس پوری نظم میں صرف ایک جگہ لفظ وطن استعمال ہوا ہے ورنہ پوری نظم علامتی ہے۔ اس میں خوبصورت تشبیہات، استعارات اور تراکیب بھی قابلِ غور ہیں۔ مثلاً: پیاسی آنکھیں، خالی کٹورے، شمعِ صبحِ وطن، دیوارِ غم، جوئے خوں، امامانِ صدمکر و فن، کالا دھواں، خونِ نورِ سحر، منزلیں دار کی وغیرہ۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "چاند تاروں کا بن" مخدوم محی الدین کی ایک کامیاب اور یادگار نظم ہے۔ آزاد نظم کے پیرائے میں لکھے جانے کے باوجود اس کے آہنگ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ چونکہ مخدوم نے اس نظم میں شعری نزاکتوں کا خاص خیال رکھا ہے اس لئے انقلاب سے متعلق ہونے کے باوجود اس میں لہجے کی تلخی یا روکھا پن نہیں ہے بلکہ نغمگی اور موسیقیت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حواشی:

شارب رودولوی، مخدوم کی نظموں کا آہنگ، مشمولہ: فکر و تحقیق، شمارہ نمبر۔۲، جلد ۱۱، اپریل۔مئی۔جون ۲۰۰۸، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، ص: ۵۸

☆☆☆

نظمیں Nazmein

Ishfaq Anjum Samoon(Bandipora)
cell-7889425720
اشفاق انجم سامون (بانڈی پورہ)

وادیٔ تلیل

دسمبر کا مہینہ ہے
ابھی تک ہوں یہیں میں
سفید برف کی چادر ہے
تلیل کی وادیوں میں
اونچے اونچے پہاڑ
بے مثال اس کی ندیاں
اور بہتے ہوئے پرنالے
میدان اس کے کیا خوب نرالے
"پنز" انہیں وادیوں میں
بہار میں چمکتے ہیں
اس طوفانی موسم میں
برفانی دنیا کے
ان مکینوں کے جینے کی لگن
خدمت خلق جن کا ہے ایمان
طلسمی دنیا شاید بسی یہیں ہے
پریوں کی آماجگاہ شاید یہیں ہے
جب پگھلتی ہے برف آہستہ آہستہ
لگتا ہے موتیوں کی جیسے اک لڑی ہے
اب پھر یہاں آمد بہار ہے
جو اپنے ساتھ لاتی کئی روزگار ہے
گناہ بل، گاڈسر، ناراض ناگ، سٹی سر
اور جوگی جائیں گے
انگلش کوٹ سے آگے عبدلین دیکھیں گے
بسا تھامدت سے جوڈارہ اک گام
پرانا تلیل جس کو کہتے ہیں سب
ہے شرف حاصل بسنے کا پہلے
کہنے میں آتا ہے کوہستانی سار بانوں کی تھیں
یہ شکارگاہیں/کوہ علاوادین پربت بھی ہے
جو سب سے اونچا دکھتا ہے گاؤں سے
پرانہ تلیل بسا ہے دو کناروں پر
اک طرف بسنت باغ/دوسری طرف کوہ سلیمانی
اول ملتا ہے" برنائی" گاؤں
بسا ہے دامن کوہ پر لب دریا
گزرتی ہے یہیں سے راہ وادیٔ تلیل کی
رستے میں ملتا ہے" کشپاٹ" پھر
ہوتا ہے دیدار پھر" کلشے" کا ہم کو
بستے ہیں جہاں نو گاؤں
آگے نظر پڑتی ہے" ڈڈگی" مقام پر
پھر بائیں طرف دو میل اندر
گاؤں" سیتنی" بھی ہے موجود
اس سے آگے انجم نہیں بڑھوں گا
جو بھول گیا ہوں آگے کبھی لکھوں گا ☆☆☆

Abdul Hamid Khan"Ghareeq"
Tulel,Bandipora)cell-7889941014
عبدالحامد خاں غریقؔ (تلیل، بانڈی پورہ)

کشمکش

آیا تھا مے کدے میں
رسماً ہی جام پینے
لیکن یہاں کا منظر
اجڑا ہوا پڑا تھا
سارے ایاغ ٹوٹے
ساغر بکھر چکا تھا
فانوس شب شکستہ
چپ چاپ جل رہا تھا
چنگ و رباب یکسر
گوتم کے بت بنے تھے
اس تیرگی میں لیکن
دہلیز سے چپک کر
احوال ہجر کو میں
چلمن سے تک رہا تھا
وہ دلربا جو ہر جا
کرتی تھی رقص پیہم
زلفوں سے خود کو ڈھک کر
ماتم منا رہی تھی
زلفوں میں سر چھپا کر
شدت سے رو رہی تھی
شاید وہ چاہتی تھی
محسوس میں بھی کرلوں
سب خواہشات اس کی
لیکن خفا تھا میں بھی
وہ بھی جدا جدا تھی
اک مئے کدے کے اندر
اک مے کدے کے باہر

☆☆☆

Afsana افسانہ

Khwaab Reza Reza by Ashiq Akaash (barnati, Anantnag)

cell-9906705778

عاشق آکاش (برنٹی اننت ناگ کشمیر)

''خواب ریزہ ریزہ''

وہ دور سے ایک بڑے پتھر کی باہوں میں اپنی باہیں ڈالے غور سے مشاہدہ کر رہی تھیں۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں دوپٹے کا کنارہ تھا، جس سے وہ ہلکے ہلکے اپنے موتی نما معصوم دانتوں سے ایسے چبا رہی تھی، جیسے کہ لالی پاپ کا مزہ چکھ رہی ہو!!!! میں نے اپنے قدموں کو اُس کی اور موڑا ہی تھا کہ وہ ایک غزال کی رفتار سے ایک گھنے، سرسبز دیودار کی طرف بھاگی، جس پر کچھ مدہوش کرنے والی آوازیں اُسے اپنی اور بُلا رہی تھیں۔ وہ چھُپنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن چھُپ نہ سکی۔ اس کا دل بھی اُسے مجھ سے دور رہنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اُس کے دل میں لاکھوں ان کہی کہانیاں چھُپی تھیں۔ وہ کہانیاں جن کو اُس نے پچھلے سات سال سے اپنے من میں پال کے رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں سپنوں کا ایک سمندر تھیں۔ ہرنی جیسی آنکھوں کو قدرت نے فطری سُرمے سے مالا مال کیا تھا۔ جس کے ختم ہونے کا اندیشہ بھی نا ہو۔ اُس کے ہونٹوں پہ گلابوں کی لالی رچی تھی، یخ نما ہواؤں نے اُس کے چہرے کو اور رنگت بخشی تھی۔ پھٹے کپڑوں میں وہ جنت سے بچھڑی کسی حور سے کم نہیں دکھ رہی تھی۔۔۔

میں نے اُسے نظر انداز کرنا چاہا تاکہ وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگے، اور نہر کے کنارے تیز رفتار آبشاروں کا لطف اُٹھاتا گیا۔ لیکن اُسے ملنے کی خلش میرے روح میں ایک تناؤ سا پیدا کرنے لگی۔ میں ترچھی نظروں سے اُس کی حرکتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی مجھ سے ملنے کی تاک میں تھی۔ لیکن اجنبی ہونے کے باعث شرما رہی تھی۔ وہ چوری چوری میری حرکتوں کو دیکھتی تھی اور ایک معصوم سے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے کی چاہ جتا رہی تھی۔ اُسے آج نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی بھینسوں کی بھی فکر نہ تھی۔ جن کو اُس نے کئی بار کھویا بھی تھا اور اِس لاپرواہی کے عوض ڈانٹ بھی پڑی

تھی۔ایک دو بار تو اُس کے باپ نے اُس کے گُلاب نما چہرے پر ایک دو تھپڑ بھی رسید ے تھے۔اُس کے دو پٹے کا کنارہ اب تک اُس کے دانتوں تلے ہی تھا۔۔۔

گھنے جنگلوں کے سائے میں پپیہے جلملا رہے تھے۔آبشاروں کی گونج اور مستی میں ہر کوئی مست تھا۔فطرتی سنگیت کی ان دھنوں میں کسی غم و غصے کا اظہار ہو،سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔بھیڑ بھری ،تیز رفتار دنیا سے بالکل ہٹ کے، پریشانیوں سے ایسا پاک جیسے کہ انسان ابھی ابھی جنا ہو۔گو یا کہ کچھ ہی منٹوں کے سفر نے اسے دوسرا جنم بخشا ہے اور وہ جنت کی حسین وادیوں میں بے خوف وخطر گھوم رہا ہے۔ یہاں وہ خالقِ کائنات سے روبرو گفتگو کر رہا ہے۔ ایسے مست ماحول میں ایک ننھی سی جان کے حال دل کو سننے کی شائد ہی کسی کو فرصت ملے۔ایک وہ ہی تھی جو اس دھوم دھام اور حل چل بھرے ماحول میں بھی خاموش تھی۔اُس پہ اِن جنت نما نظاروں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔وہ اِس سب سے اُکتا گئی تھیں۔۔۔

مجھے اب اِس سارے نظارے میں ایک اُسی کی معصومیت دِکھتی رہی۔وہ میرے دل و دماغ کی توجہ کا مرکز بن گئی۔مجھے اب اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوئی دلچسپی ہی نہیں۔جن کے ساتھ میں یہاں ایک طویل وقت کے بعد فرصت نکال کر آیا تھا۔وہ مجھے اب اجنبی دکھنے لگے۔میرا دل صرف اُس ننھی سی جان کی آنکھوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اُس میں چھپے برسوں کے راز جاننے کی تمنا میں بے قرار تھا۔میں اُس کی طرف اِس قدر راغب ہو گیا گو یا کہ اُس کا اور میرا جنموں کا رشتہ ہو۔۔۔

میں نے ننگے پاؤں اُس کی اور چلنا شروع کیا۔کیونکہ میں نے اپنے جوتے اپنے ساتھیوں کے پاس نکال رکھے تھے۔راستے میں نیم بوسیدہ لکڑی میں بچھے کنکر اور کانٹے بھی اُس سے میری توجہ نہ ہٹا سکے۔اُس میں بھی اب ہٹنے کی ہمت نہیں تھی۔وہ چنار نما دیودار کے کنارے ہی اپنا گُلابی چہرہ چھُپائے بیٹھی۔میں نے ابھی اُس کے ساتھ بات شروع ہی کی تھی کہ اچانک اس کی آنکھوں کا سمندر اسکی پلکوں کے کناروں کو ڈبوتا ہوا بہنے لگا۔۔۔اس کے آنسوؤں کا بہاو ان حسین نظاروں کو بھی بہا لے گیا۔میری آنکھیں بھی نم ہو گئی ۔ میرے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔میرے ہاتھ پیر منجمد ہو گئے۔ہوتے بھی کیوں نا؟؟؟ ایک جنت نما وادی میں کوئی افسردہ ہو، یہ انسانی سوچ سے کوسوں دور ہے۔میں ایک بے جان شئے کی مانند اُس کی داستان سنتا گیا۔۔۔

رُخسانہ تب صرف تین سال کی تھی جب اُس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔اُس کی ماں کلثم بی بی لکڑی کاٹتے وقت تیندوے کا شکار بنی تھی۔بے چاری چست و چالاک تھی اور خوبصورت بھی۔

کلسم کا لہولہاں چہرہ رخسانہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس کی وہ چیخیں آج بھی رخسانہ کے جگر کو کُرید رہی ہیں۔ اُس نے ایک ایسے سائے کو کھویا تھا جس کی چھاؤ آسمان کو چھونے والے درختوں سے کئی زیادہ لطف اندوز تھی۔ وہ ایسی آغوش سے بچھڑی تھیں جو ایک ابدی سکون کا باعث تھی۔ ویسا سکوں رخسانہ نے ان حسین وادیوں میں کبھی پایا ہی نہیں۔ اِسی سال رخسانہ کی دادھی کا بھی انتقال ہوا تھا۔ بے چاری کلسم کی موت سے دیوانی ہوئی تھی۔ سہہ نہ پائی۔۔ اور جاڑے کے موسم میں حرکتِ قلب بند ہونے سے داعی اجل کو لبیک کر گئی۔۔۔

رخسانہ کے ابو، اصغر علی نے اب شہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر کا سارا کام کاج کلسم کے حوالے کر کے شہر مزدوری کی خاطر جاتا تھا۔ بھیڑ بکریا چرانا، بھینسوں کو چارہ ڈالنا، جنگل سے چولہے کے لئے لکڑی لانا، رُخسانہ کا خیال رکھنا، یہ سب کلسم کے ذمے تھا۔ پہاڑوں کی اِن چوٹیوں پہ انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے تو میدانی علاقوں کا رُخ کرنا لازمی بن جاتا ہے۔ بے چارہ اصغر علی بھی یہی عمل کرتا رہا، چہ جائے کہ وہ آزاد فطرت کا مالک تھا۔۔۔ اب گھر کا سب کام اصغر علی کو خود سنبھالنا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ گھر کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اصغر علی اپنے آرام کی طلب میں در در کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ رُخسانہ درختوں کی پرچھائیوں میں کلسم کو تلاش کرتی رہی۔ کچھ عرصہ اسی کشمکش میں یوں ہی بیت گیا۔۔۔ ایک دو سال کے بعد اصغر علی کو ایک نئی جورو مل گئی اور رخسانہ کو چرانے کے لئے بھینسیں۔۔۔

اب کلسم کی جگہ فریدہ لے چکی تھی۔ رخسانہ کے لئے نا سہی!!! مگر اصغر کو گھر کی جھنجھٹ سے آزادی ضرور ملی تھی۔ فریدہ، کلسم کی طرح چاک و چوبند ہرگز نہ تھی۔ پیڑ پر چڑنا تو دور، کٹی لکڑیا بھی اُس کے لئے بار آور ثابت ہوتی تھی۔ شوہر کی موت نے اُس کی ہڈیوں کی قوت کو بھی اُڑایا تھا۔ اِن پہ گوشت کا نام و نشاں ہی نہیں۔ چہرے پہ جوریوں کے ریگستاں۔۔۔ ناک اور آنکھیں جیسے بناوٹی۔۔۔ اتنی نازک، کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا بھی اپنے ساتھ اُڑا لے جاتا۔۔۔ بے چاری کو چولہے سے فرصت ملتی تو وہ رخسانہ کے بالوں میں کنگی کرتی۔ اُس کے ہاتھ میں چھڑی کے بجائے قلم تھماتی۔ اُس کے سکول کے بستے کو سی لیتی۔ اُس کے پھٹے کپڑوں میں پیوند لگاتی۔ لیکن گھر گرہستی کے بوجھ تلے وہ یہ سب نظر انداز کرتی رہی۔ اِس کے علاوہ چارہ تھا بھی کیا؟؟؟ لیکن اندر ہی اندر معصوم رخسانہ کی بدنصیبی اُس کو تڑپاتی رہی۔۔۔

اُدھر اصغر علی کو بھی مزدوری سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ رخسانہ کی پڑھائی تو دور اُس کی اور

توجہ دینا بھی مُحال ہوگیا تھا۔شام کو تھکا ماندہ وہ اپنے پتھروں اور لکڑی سے بنے کوٹھے، جس میں مکڑیوں نے رُخسانہ کے ارمانوں کا نقش کھینچ رکھا تھا، میں دراز دن کی تھکان کو دور کرنے کے لئے فریدہ کو مفلسی کے تمام راگ سنایا کرتا۔اور وہ بے چاری بھی۔۔۔اپنی نازک بدنی کے باعث سب کچھ چُپ چاپ سہہ لیتی۔رُخسانہ میاں بیوی کا یہ تناؤ خاموشی سے عکس کر لیتی۔اُس کا دم گُھٹ جاتا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوں ٹپکتے۔وہ کونے میں سہم جاتی۔یہ اب اس کا معمول بن چکا تھا اس لئے زیادہ دیر تک اثر بھی نہیں رہتا۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اُس کی طرزِ زندگی میں ان حالات کا اثر عیاں تھا۔۔۔اصغر علی میں اب کام کرنے کی ہمت نہ تھی۔مصیبتوں نے اُس کی کمر ہی توڑی تھی۔لیکن فریدہ اور رخسانہ کے حالات کو دیکھ کر مجبور ہو جاتا۔اُس کے دل میں بھی ارمان تھے۔وہ بھی سپنوں کی دنیا میں سیر کرتا تھا۔وہ بھی رُخسانہ کو پڑھانا چاہتا تھا۔لیکن گھر کے حالات ہی ابتر تھے۔اب اس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ اضافی مزدوری کر کے رُخسانہ کا داخلہ کسی اچھے سے اسکول میں کرے گا۔اب وہ صبح سویرے کام پہ نکلتا تھا۔۔۔طلوعِ آفتاب سے پہلے۔۔۔ایک دن گیا اور واپس ہی نہ آیا!!! دو تین مہینے بعد دریا کے کنارے اصغر علی کا سڑا جسم ملا۔

رخسانہ اپنی جیسی سینکڑوں پریوں کو اس فرضی جنت سے نکالنا چاہتی تھی۔یہ جنت اُن کے لئے کسی قید خانے سے کم نہیں۔اُن کی ماؤں نے تو باہر کی دنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔دیکھنا تو دور وہ شائد ہی اس بات سے واقف تھے کہ پہاڑوں کی اس چار دیواری کے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ایک ایسی دنیا جہاں زندگی کی سبھی سہولیات میسر ہیں۔جہاں بچوں کا بچپن رائیگاں نہیں، جہاں عورتوں کے ارمان لکڑیوں کے بوجھ تلے نہیں دھب جاتے۔ایک ایسی دنیا جہاں درندوں کا ڈر نہیں۔اُن کو ایسی جنت سے نفرت ہے جہاں حوروں کا حُسن تیندوؤں کے پنجوں کا شکار ہو، جہاں کم سنوں کے ہاتھوں میں قلم کے بجائے بھینسوں کی چھڑی ہو۔جہاں کنواریوں کا شباب آبشاروں اور دیوداروں کے سائے کی نظر ہوتا ہو۔اُس کے من میں خواب تھے۔ایسے خواب جن کا اظہار وہ کسی سے کر نہیں پاتی۔جن کا شرمندۂ تعبیر ہونا اُس کو ناممکن لگ رہا تھا۔وہ سیاحوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو تلاش کرتی تھی۔اُن کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں ڈھونڈتی تھی۔اُن کو اپنا حالِ دل سنانا چاہتی۔انہیں بتانا چاہتی کہ وہ بھی ایک انسان ہے۔وہ بھی آدم کی اولاد میں سے ہے۔اُس کے جسم میں بھی ایک دل ہے، جو خوابوں کی دنیا سے بھرا پڑا ہے۔۔کسی نمائش گھر کی زینت نہیں!!! جس سے لطف اندوز ہو کر تم چلے جاتے ہو۔لیکن ہر وقت ناکام رہتی۔۔۔

آج اُس نے اپنے دل کے سارے در کھول دئے۔ وہ، وہ بھی بتا بیٹھی، جس کو شائد بولنے کا وہ ارادہ بھی نہ رکھتی تھی۔ شعور اور تحت الشعور کا فاصلہ مٹ گیا۔ اُس نے اپنی زندگی کے دس سال ایک کھلی کتاب کی مانند میرے سامنے رکھ دئے۔ میں نے بھی پوری داستان سنتے پلک تک نہ جھپکی۔ میرے لبوں پہ مہر پڑ گئی!!! جیسے کہ میں کلامِ الٰہی کی تفسیر کا وعظ سن رہا تھا۔ مجھے اب آس پاس کے نظارے ناقص دکھنے لگے۔ میری آنکھیں نم ہوگئی۔ وہ مجھے سنبھالنے لگی جیسے کہ کوئی عمر رسیدہ آدمی ایک معصوم بچے کا دل بہلا رہا ہو۔ میں بھی مصیبتوں کی اِس خیالی بستی سے باہر آ گیا۔ میں نے ایک لمبی سانس لے لی۔ میں چلانا چاہتا تھا۔ میں اِن حسیں وادیوں میں چھُپے غم واندوہ کی داستان سب کو سنانا چاہتا تھا۔ میں جنت کے ان بغیچوں میں پھرتی حوروں کی تڑپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ جن کا حُسن غلماں کے لوٹنے کے انتظار میں جَڑ چکا تھا۔ میں اِن سنہری وادیوں کے اندر بیٹھے فرشتوں کی پکار کو سنانا چاہتا تھا جو ہر صبح وشام اپنے ریزہ ریزہ خوابوں کو سمیٹنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ میں اِن جنگلوں کو مٹانا چاہتا تھا، جن کے گھنے سایوں میں کئی دوشیزاؤں کے سہاگ لٹ گئے تھے۔ میں کوٹھوں میں لگی مٹی کے راز بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اِس بھیڑ بھری محفل میں میری طرف کسی کی نظر بھی نہ پڑی۔ میرے اپنے ساتھی بھی اُچھل کود میں مست تھے۔ وہ سب آبشاروں کے سنگیت میں اپنا من بہلاتے رہے۔ اور اس سنگیت کی دُھنوں میں میرے من کی پکار مدغم ہوتی گئی۔ میں اب سمجھ گیا تھا کہ لوگوں کے اس رویئے سے رخسانہ پر کیا بیتتی ہوگی۔ اس نے کئی سال سے برداشت جو کیا تھا۔ وہ سچ میں ایک بہادر لڑکی تھی۔ ہاں بہادر۔۔۔ اور نڈر بھی۔۔۔۔ رخسانہ کو اپنی بھینسوں کی ذرا بھی فکر نہیں۔ جیسے کہ اُس نے کبھی وہ دیکھی بھی نا ہوں۔ اُسے اب ان کے کھونے کا ڈر بھی نہیں۔ وہ اپنے کوٹھے میں بنے مکڑی کے جال کو بھی بُھول چکی ہے۔ وہ اُن آبشاروں اور سبزہ زاروں پر بھی فریفتہ نہیں، جن پر انگنت لوگ اپنا مال و زر لُٹاتے ہیں۔ وہ ایک ابدی سکون کی تلاش میں ہے۔ اُسے میری آنکھوں میں حسین وادیوں کے منظر دکھنے لگے۔ مکڑی کے جال میں بُنے سپنوں کی تعبیر دکھنے لگی۔ اُس کے من کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گُم تھیں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ آنسوؤں سے نہیں!! بلکہ اُن سب مناظر کی عکاسی سے جن کا ذکر رُخسانہ نے مجھ سے کیا تھا۔ اُس نے کس کے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی:

''چاچا!!! آپ کیا کرتے ہو؟؟؟ آپ ڈاکٹر ہو کیا؟؟؟'' وقت ضائع کئے بغیر میں نے جواب دیا؛ ''نہیں بیٹا میں ایک اُستاد ہوں'' معصوم لہجے میں؛

''اچھا!!! اچھا آپ ماشٹر ہو۔۔۔ ماشٹر۔ جو بچوں کو پڑھاتے ہیں!!!''

مسکراتے ہوئے مزاحیہ انداز میں میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے؛

''ہاں!! میں ماشٹر ہوں۔۔ماشٹر!!! میں بچوں کو سبق پڑھاتا ہوں۔اور ڈانٹتا بھی!!!''

وہ بھی مسکرائی۔شائد اُسے میری ڈانٹ والی بات ہضم نہیں ہوئی۔۔۔

وہ اُچھلتی ہوئی۔جیسے کہ ماضی کے تمام رنج وآلام کو بھُول چکی ہو؛

''پھر، مجھے بھی پڑھاؤ گے کیا؟؟؟ میں بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ پڑھ لکھ کے اپنی بستی کو اِس دلدل سے نکالنا چاہتی ہوں۔میرا یہاں دم گُٹتا ہے۔ مجھے اِس جنت سے ڈر لگتا ہے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں!!! ہاں ان پہاڑوں سے بہت دور جانا چاہتی ہوں۔ اِن ہواؤں میں مجھے اپنی ماں کے لہو کی بُو آتی ہے۔ اِس دیودار کے سائے تلے مجھے اپنے ابو کا سایہ نظر آتا ہے۔ اِن آبشاروں کے سنگیت میں مجھے درندوں کی دھاڑیں سنائی دیتی ہیں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔۔۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔۔۔ چاچا۔۔۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔۔۔ ہاں میں یہاں نہیں رہنا چاہتی''

وہ چلاتی رہی ،چیختی رہی اور مجھ سے وہاں سے نکالنے کی مَنتیں مانگتی رہی۔وہ پھر سے افسردہ ہوگئی۔۔۔ میں خاموش، لاچار اُس کی چیخ و پکا وسنتا رہا۔ میرے بس میں اُسے دلاسہ دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ میرے پیروں تلے ایک زندہ لاش کی طرح تھی۔لیکن میرے ہاتھ کو اب بھی پکڑے ہوئی تھی۔ مجھے اپنے وجود پر، اپنے زندہ ہونے پر شک ہونے لگا۔ کیونکہ شائد ہی کوئی انسان ایسے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد زندہ رہ پاتا۔ میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ میں خیالوں کے ایک طوفان میں آوارہ پھرتا رہا۔ اُس کی افسردہ نگاہیں مجھ سے التجا کرتی رہی۔ میری نم آنکھیں بھی اپنی لاچاری کا ثبوت دیتی رہی۔ اور ہم ایک دوسرے کو بنا کچھ کہے تکتے رہے۔ ہاں مگر ہمارے روح گفتگو میں مشغول ضرور تھے۔۔۔شام نے اپنی پرچھائی میں پیڑوں کے سایوں کو مدغم کرلیا۔ پرندے شور مچاتے ہوئے اپنے آشیانوں کی اور آنے لگے۔ مجھے بھی اپنے ساتھیوں نے گھر لوٹنے کی خاطر بُلالیا۔ اُس نے میرا ہاتھ ایسے چھوڑا جیسے جسم سے روح نکلی ہو۔ میں رنجیدہ ہوکے اُس کے سارے سوالوں کا جواب دئے بغیر ہی وہاں سے نکلا۔شائد اُس کے سوالوں کا میرے پاس کوئی حل نہ تھا۔ وہ بھی دور تک مجھے دیکھتی رہی۔حتٰی کہ میں اُس کی آنکھوں سے اُوجھل ہوگیا۔سورج کی سُرخ کرنوں میں وہاں کے حالات کی عکاسی ہورہی تھی جن میں رخسانہ کے خواب ریزہ ریزہ دِکھ رہے تھے۔۔۔۔۔

☆☆☆